مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

جس نے اچھے عمل کئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اُسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید

کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

حیاتِ پیر بابا

شہنشاہِ خراساں غوثِ زماں

سیّد علی غواص ترمذیؒ

کے حالاتِ زندگی

منصور حیدر راجہ



محمد شفیع صابر

نام کتاب : حیاتِ پیر بابا

تاریخی نام : بحرِ شریعت و معرفت

١٩٨٦ء

تالیف و ترتیب : محمد شفیع صابر

کتابت : محبوب الرحمٰن خوشنویس

بار اوّل : ایک ہزار

قیمت : چالیس روپے

مطبع : فیاض مستغیر پرنٹرز۔ ١٧ دربار مارکیٹ لاہور

اہتمام : سیّد محمود شاہ ترمذی

ملنے کے پتے : ١: یونیورسٹی بک ایجنسی۔ خیبر بازار۔ پشاور

(ٹیلیفون: 62534)

٢: فارورڈ ہائی سکول۔ آسامائی۔ پشاور

(ٹیلیفون: 61273)

٣: سیّد محمود شاہ A-28۔ سول کوارٹرز پشاور

(ٹیلیفون: 65343)

مندرجات



۷۸۶

ہدیۂ عقیدت

بحضورِ غوثِ زماں، اعلیٰحضرت سیّد علی غواص ترمذی المعروف پیر باباؒ

ہدایت کے زندہ نشاں پیر باباؒ — طریقت کے اک رازداں پیر باباؒ

محبت کے ملجا، عقیدت کے ماویٰ — رفیع نشاں، خُلد آشیاں پیر باباؒ

خزاں کا جہاں تک گذر ہی نہیں ہے — وہ اِک گلشنِ بے خزاں پیر باباؒ

ہر اِک دل ہے انکی محبت سے روشن — ہیں وہ مشعلِ ضَوفشاں پیر باباؒ

کھچے آرہے ہیں سلامی کو سب لوگ — ہے دربارِ غوثِ زماں پیر باباؒ

شہنشاہ بھی جھک رہے ہیں جہاں پر — وہی ہے ترا آستاں پیر باباؒ

تری ہی نظر کا ہے فیضان سارا
کہ صابرؔ بھی ہے مدح خواں پیر باباؒ



منقبت

بحضور غوث زمان سیّد علی غواص المعروف پیر بابا علیہ الرّحمۃ

از۔ سردار سعد اللہ خان سعد صاحب
ڈیرہ غازی خان

پیر بابا، فخرِ ملّت، فخرِ دین — راز دارِ رمزِ قرآنِ مُبین
پاش از ضربش بُتانِ آذری — لَا اِلٰہ مردِ حق گفتن ببین
من چہ گویم رفعتِ آں خاکِ پاک — بر مزارش چرخ می مالد جبیں
لالہ ہا رُوید زِ خاکِ پاکِ او — تا دہد با ملّتش سوزِ یقین
کرد تعمیرِ جہاں از خونِ خویش — پیر بابا رحمہ، افتخارِ مُسلمیں
ضربِ او کاری چوں مردِ پختہ کار — حرفِ او شیریں چوں مثلِ انگبیں

می کُنم صد بار شکرِ کردگار
سعد گر بینم رُخِ آں نازنین



ہدیۂ عقیدت

بحضور قدوۃ السالکین، امام المتقین حضرت پیر بابا بونیری علیہ الرّحمۃ

سیّد محمد معصوم شاہ ترمذی (ایم اے ایل ایل بی)

مجھے اپنا جلوہ دکھا پیر باباؒ
یہی ہے مری التجا پیر باباؒ

بڑی دیر سے منتظر ہیں نگاہیں
ذرا رُخ سے پردہ ہٹا پیر باباؒ

من و تو کا جھگڑا رہے پھر نہ باقی
مجھے جام ایسا پلا پیر باباؒ

کوئی ایسا انداز مجھ کو عطا کر
کہ ہو جائے نالہ رسا پیر باباؒ

سوالی تیرے در سے جائے نہ خالی
فقیروں کی ہے یہ صدا پیر باباؒ

تمنّا ہے اتنی غلاموں کو اپنے
محبّت میں کر دے فنا پیر باباؒ

زمانے کو تسلیم ہے یہ حقیقت
کہ ہو تم شہِ اولیاء پیر باباؒ

دیا تھا شجاعت کا جو درس تم نے
اُسے جب سے بیٹھے بھلا پیر باباؒ

زمانے میں اب کوئی عزت نہیں ہے
ہیں اپنے پرائے خفا پیر باباؒ

زمانہ مٹانے پہ اب تل گیا ہے
خدا را ہے وقت دُعا پیر باباؒ

وہ غیرت، شجاعت، حمیّت کہاں ہے
مسلماں کو کیا ہو گیا پیر باباؒ

بھنور سے نکلنے کی صورت نہیں ہے
عجب شے ہے موج بلا پیر باباؒ

عطا کار ہے تو خدا جانتا ہے
عطا کر، عطا کر، عطا پیر باباؒ

فقیروں سے رکھنا ہے الفت ہمیشہ
ہے معصوم کی یہ خطا پیر باباؒ

حضرت پیر بابا بونیری رح

پُر لطف و پُرکشش ہے دربارِ پیر بابا رح
رحمت کا اک جہاں ہے سرکارِ پیر بابا رح

اعزاز کیوں نہ ملتا دربارِ کبریا سے
بے مثل و بے غرض تھا ایثارِ پیر بابا رح

ایسا نہ ہو کہیں سے الحاد سر اٹھائے
ہر سمت دوڑتا تھا رہوارِ پیر بابا رح

وہ فخرِ صوفیا ہیں سردارِ اولیا ہیں
کس درجہ دل نشیں ہیں اقدارِ پیر بابا رح

یاں وجد میں ہے کوئی، کوئی مراقبہ میں
چھائے ہوئے ہیں ہر سُو انوارِ پیر بابا رح

ان کے نقوشِ پا ہیں درسِ حیاتِ کامل
راہبر ہیں، رہ نما ہیں اطوارِ پیر بابا رح

سب طالبانِ حق کو یاں سے ملی ہدایت
عظمت کا اک نشاں ہیں افکارِ پیر بابا رح

پیغامِ مرگ ہے یہ کفار و فاسقوں کو
چلتی ہے حق کی خاطر تلوارِ پیر بابا رح

کرلے قبول مولا، میری اس اک دعا کو
ہو جائے مجھ کو اک شب دیدارِ پیر بابا رح

اے فکرؔ! بڑھ کے اُن کو میں چوم چوم لوں گا
آئیں نظر جو مجھ کو آثارِ پیر بابا رح

نتیجہ فکر :-



ڈیرہ غازی خان

اظہار تشکر

اس مسکین بے تمکین کو بہت عرصہ سے جدامجد اعلیحضرت پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ (بونیری) کے حالات اور ان کی اولاد کے شجرے فراہم کرنے کا شوق دامنگیر تھا مگر کم مائیگی، بے بضاعتی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہمت نہیں پڑتی تھی چنانچہ یہ تذکرہ میں نے جناب محمد شفیع صابر صاحب (پشاور) سے کیا تو انہوں نے باوجود مصروفیات کثیرہ و کمزوریٔ صحت کے بلاتامل بغیر کسی دنیاوی طمع و لالچ کے یہ بیڑہ اٹھالیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں ایک عمدہ، جامع اور جاذب قلب مسوّدہ تیار کردیا۔ ان کا یہ کارنامہ محض اسلامی جذبہ اور اہل اللہ سے گہری عقیدت ومحبت کا ثمرہ ہے اس پر ان کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے اور ان کی جتنی داد دی جائے، کم ہوگی۔ یہ مسکین بھی دعاگو ہے اور قارئین کرام سے بھی التماس ہے کہ ان کی درازیٔ عمر مع صحت کاملہ اور ترقی درجات فی الدارین کے لئے دعا کریں۔

یہ مسکین ان کے علاوہ ان کے برخوردار ظفرالاسلام کا بھی شکر گذار ہے کہ انہوں نے کتابت کے معاملے میں پوری تگ ودو سے کام کیا۔ سب سے زیادہ قابل مسرّت و باعث شکر امر یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت علامہ اجل قاضی عبدالدائم مدظلہ العالی سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ ہری پور (ہزارہ) نے اس مسودہ کو محض پسند ہی نہیں فرمایا بلکہ اس پر ایک دلکش وفاضلانہ تعارف لکھ کر اس کتاب کی زینت میں اضافہ فرمایا۔

جزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَبَارَکَ وَسَلَّمَ عَلٰی حَبِیْبِہٖ وَعَلٰی اٰلِہٖ قَدْرَ حُسْنِہٖ وَجَمَالِہٖ

مسکین سیّد محمود شاہ ترمذی

ریٹائرڈ ایڈمنسٹریٹو افسر محکمہ تعمیرات ومواصلات پشاور

تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِيْبِهِ الْکَرِيْمِ۔

پیر بابا وہ پیارا نام ہے جو صوبہ سرحد کے بچے بچے کی زبان پر ہے، ہر دل اُن کی یاد سے سرشار ہے اور ہر سر ان کا نام سنتے ہی فرطِ عقیدت سے جُھک جاتا ہے، صدیاں گذر جانے پر بھی ان کی عقیدت و احترام میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، کوئی موسم ہو، کوئی زمانہ ہو، ٹرکوں، بسوں، ویگنوں اور کاروں پر جھنڈے لہراتے ہوئے زائرین بونیر میں ان کے مرقدِ مبارک کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وزیرستان سے چترال تک اور آزاد کشمیر اور ہزارہ سے خیبر اور جلال آباد تک شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس کا دل پیر بابا کی یاد سے آباد نہ ہو ــــ اس بزرگ ہستی سے لوگوں کی محبت اور عقیدت بالکل بجا ہے، اس لئے کہ ہمیں دولتِ دین ملی تو انہی اولیائے کرام اور مبلغین عظام کی بدولت ملی اور ایمان کی دولت سے بڑھ کر قابلِ قدر نعمت اور کیا ہو گی اور کیا ہوسکتی ہے؟ ــــ یہ حضرات بلاشبہ ہمارے محسن اور مربّی ہیں۔ لیکن اسے تغافل و تساہل کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے کہ آج تک پیر بابا علیہ الرحمۃ جیسی جامع کمالات ہستی کے بارے میں کوئی مفصّل اور سیر حاصل تصنیف منظرِ عام پر آنے پائی ــــ اور عقیدت و احترام کے باوجود لوگ اُن کی جامع کمال شخصیت، ان کے کارناموں اور کوششوں سے کما حقہٗ آگاہ ہونے نہ پاتے۔

بدقسمتی سے مغربی افکار اور لادینی نظریات کی یلغار سے آج کے نوجوان کا ذہن کچھ اس طرح متاثر ہوا ہے کہ وہ تصوّف و طریقت سے "الرجک" دکھائی دیتا ہے

ہادیان طریقت کا نام سنتے ہی ان کے ذہن میں کسی تارک الدنیا، چلہ کش اور ازکار رفتہ انسان کا ہیولیٰ ابھرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگان کرام سے بڑھ کر فعال اور بیدار شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ یہ وہ مجاہدین فی سبیل اللہ تھے جنہیں نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام ۔۔۔ انہیں لگن تھی تو بس یہی کہ اللہ کے دین کو بحر و بر اور کوہ و دمن کے گوشے گوشے تک پہنچا دیں۔ ان کے کارنامے حیرت انگیز اور ان کا جہاد تعجب خیز تھا ۔۔۔ اور ان سے بڑھ کر مردان کار اور مجاہدین شاید ہی کوئی اور ہوتے ہوں۔

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پیشتر ذرا اس وقت کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر پر نگاہ دوڑاتے، گندھارا یا قدیم صوبہ سرحد آریائی اور ہندو تہذیب کا عظیم گڑھ تھا ۔۔۔ بالخصوص سرزمین یوسف زئی (جو زیادہ تر حضرت پیر باباؒ کی سرگرمیوں کی جولان گاہ رہی) کفر، شرک اور بودھ مت کا مرکز تھا۔ شہباز گڑھ تخت بائی، ہنڈ، سوات اور دیر کے آثار قدیمہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں اللہ واحد کا ایک بھی نام لیوا نہ تھا۔ ان کافر حکمرانوں نے نہ صرف پہاڑوں کے ہر کلیدی مقام پر قلعے بنا رکھے تھے بلکہ پہاڑی غاروں میں بھی دفاعی مرکز قائم کر رکھے تھے ۔۔۔ شہنشاہوں کی فوجیں بھی انہیں مسخر کرنے سے عاجز آچکی تھیں لیکن کفر اور شرک کی ان طاقتوں کو زیر کیا تو حضرت پیر باباؒ اور دوسرے اولیائے کبار اور مبلغین والا تبار ہی نے کیا ۔۔۔ ان بزرگان کرام نے نہ صرف کافروں اور مشرکوں کی دنیوی وجاہت کے بت پاش پاش کر کے رکھ دیئے بلکہ انہیں اسلام کی روشن تعلیمات سے روشناس کیا اور اس شان سے تبلیغی فرائض انجام دیتے کہ آج ان سارے علاقوں میں ڈھونڈنے سے بھی کسی کافر اور مشرک کا نشان تک نہیں ملتا۔ کسی نے خوب کہا ہے، شہنشاہ اور سلاطین لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتے ہیں لیکن اللہ والے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں ۔۔۔ کفر زار ہند اور بالخصوص کوہستان سوات و بونیر میں ایک

عظیم اور مبارک اسلامی انقلاب رونما ہوا تو حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمتہ ہی کی کوششوں اور مجاہدانہ مساعی سے ہوا۔

حضرت پیر بابا کی مفصل سوانح حیات مرتب کرنے کا خیال سب سے پہلے انہی کے خانوادہ کے چشم و چراغ الحاج سید محمود شاہ ترمذی مدظلہ العالی کے ذہن میں آیا۔ شاہ صاحب کی ترغیب پر اس کام کا بیڑا جناب محمد شفیع صابر صاحب نے اٹھایا۔ صابر صاحب جہاں انگریزی کے ایم۔ اے ہیں وہیں فارسی، عربی، پشتو اور ہندکو ادبیات کے فاضل بھی ہیں۔ قدیم و جدید علوم کی آگاہی نے انہیں ایک متوازن نقطۂ نگاہ بخشا ہے، وہ دور از کار مباحث اور اختلافی مسائل سے دامن بچاتے ہوئے اپنی بات سادگی اور صفائی سے پیش کرنے پر عادی ہیں۔ ان کی تحریر متانت کے باوصف دلچسپ اور دلکش ہے، پشاور یونیورسٹی ریڈیو پاکستان، اباسین آرٹس کونسل اور دوسرے علمی اداروں نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزازات و انعامات سے نوازا ہے "حیات محمد"۔ بہادر شاہ ظفر"۔ قائداعظم اور صوبہ سرحد" اور داستان خیبر" کے بعد ان کی ضخیم اور وقیع تالیف "تاریخ صوبہ سرحد" نے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتابیں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ اب انہوں نے "پیر بابا" کی سوانح، تعلیمات اور خدمات پر قلم اٹھایا ہے وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام کو کرنا ہے۔

میرے نزدیک تو یہ کاوش اس اعتبار سے قابل داد ہے کہ ایک ولی اللہ اور عارف کامل کا تذکرہ مرتب کرتے ہوئے انہوں نے اولیائے کرام کے عام تذکرہ نویسوں کی روش سے ہٹ کر ایک اچھوتا، دلکش اور دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جسے صحیح طور پر سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اولیائے کرام اور صوفیائے کرام کے حقیقی مشن، تبلیغی کارناموں اور مجاہدانہ کاوشوں کی آگاہی کے ساتھ ساتھ پہلے تصوف کی حقیقت و ماہیت اور مسلک صوفیاء کے متعلق علمائے راسخین کی گراں قدر آراء کو جاننا ضروری ہے۔

تصوّف کو سطحی نظر رکھنے والے بعض لوگ ایک بے کار اور دور از حقیقت امر شمار کرتے ہیں۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ تصوّف کوئی نئی چیز نہ ہے نہ کتاب و سنّت سے ورا ہے۔ جس طرح ظاہری علوم کی کئی شاخیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں منظر عام پر نہ آئی تھیں اسی طرح تصوّف بھی اپنی موجودہ شکل میں اُن دنوں موجود نہ تھی ـــــ بعد میں علمی ترقی کے دروازے کھُلے تو جس طرح دوسرے اسلامی علوم کی تدوین عمل میں آئی اسی طرح تصوّف نے بھی ایک مکتب فکر کی صورت اختیار کرلی۔ تصوّف کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عظیم مشن کے تین ارکان پر غور کریں۔ قرآن پاک کے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریق تعلیم کے تین نمایاں پہلو تھے۔ (۱) يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (۲) وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳) وَيُزَكِّيْهِمْ ـــــ یعنی اوّل آیات قرآنی اور احکامات ربّانی کا زبانی بیان فرمانا۔ دوم قرآن وحکمت یا تفقہ فی الدّین سکھانا اور سوم باطن کا تزکیہ، یعنی تصفیۂ قلب ونفس کرنا۔ آخرالذکر رکن یعنی دل کی صفائی اور تزکیۂ نفس بہت اہم ہے اور قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اس کی اہمیّت کو مزید واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے" قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا، (آخرت میں وہی کامیاب اور سرخرو ہوگا۔ جس نے نفس کا تزکیہ کرلیا) گویا تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس ہی پر آخرت کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ یہی آیت" تصوّف" پر دلالت کرتی ہے۔ تزکیہ وتصفیۂ باطن کا یہ عمل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوسِ طیّبہ میں مشکوٰۃ نبوّت سے براہِ راست آپؐ کی صحبتِ مبارکہ اور توجہات عالیہ سے رونما ہوا۔ صحابہ کبار (رضوان اللہ تعالےٰ اجمعین) سے یہ فیض تابعین اور تابعین سے تبع تابعین تک پہنچا اور بعد میں یہ سلسلہ بطریقہ بیعتِ صوفیائے کرام رائج ہوا۔ طریق بیعت صوفیا بقول حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ مسنون طریقہ ہے اور اس کے سنت ہونے پر تمام علمائے اہل سنّت والجماعت کا اتفاق ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانی نفس کا تزکیہ نہ ہو۔ عبادت کی صرف صورت ہی صورت حاصل

ہوتی ہے۔ حقیقی ذوق اور لذت عبادت اور اس کی قبولیت عند اللہ کا دار و مدار قلب کی صفائی اور نفس کی پاکیزگی پر ہے۔ تصوف کی حقیقت اور اس کے مشروع ہونے کے بارے میں علماء کرام نے مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں سے چند ایک صوفیائے عظام کے اقوال مشتے نمونہ از خروارے کے طور درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ حضرت ابو سلیمان دارانیؒ کا قول فرماتے ہیں :- بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیائے کرام کے نکات وارد ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک وارد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب تک کتاب و سنت کے دو گواہ اُن کی تائید نہیں کرتے۔ میں انہیں قبول نہیں کرتا۔"

۲۔ حضرت سہل تستریؒ کا قول ہمارے سات اصول ہیں (۱) قرآن کریم کی پابندی (۲) سُنّتِ نبویؐ کا اقتدار (۳) اکل حلال (۴) کسی کو دُکھ نہ دینا (۵) گناہوں سے پرہیز (۶) توبہ (۷) ادائے حق

۳۔ حضرت المحاسبیؒ کا قول جس نے مراقبہ اور اخلاص کے ذریعے اپنا باطن درست کر لیا اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباعِ سنت سے مزیّن کیا جاتا ہے۔

۴۔ سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کے سوا تمام لوگوں کے لئے قربِ الٰہی کے راستے بند ہیں۔

(ii) جس شخص نے نہ قرآن یاد کیا نہ حدیث لکھی ہو، طریقت میں اس کی پیروی نہیں کی جا سکتی۔

(iii) ہمارا مذہب اصولِ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے مقیّد ہے۔

۵۔ حضرت شیخ بقا ابن بطوؒ کا قول

حضرت شیخ بقا ابن بطوؒ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہم عصر تھے اور صاحب کرامات ہستی تھے۔ ان کے متعلق حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر مشائخ کو ناپ تول کر معرفت عطا فرمائی ہے مگر انہیں یہ دولت بے اندازہ عطا کی گئی ہے۔ ان کی رائے حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کے متعلق یہ ہے کہ "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا طریقہ ہر طرح کتاب و سنّت کے موافق تھا۔"

۶۔ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کا بیان

ایمان اور اتّباع سنّت سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں، جسے یہ دونوں حاصل ہوجائیں اور پھر وہ کسی اور چیز کا مشتاق ہو تو وہ شخص مفتری اور کذّاب ہے یا اسے اپنے علم کے اندازے میں غلطی لگی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار میں حضوری کا شرف حاصل ہوگیا ہو مگر وہ جانوروں کا داروغہ بننا چاہے۔

تصوّف کی تشریح اور صوفی کی تعریف میں صوفیائے کرام کے یہ چند اقوال اس لئے درج کئے گئے ہیں کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں پر واضح ہوجائے کہ مؤلف موصوف طال اللہ عمرہٗ و زاد عزہٗ نے اعلیٰ حضرت غوث زمان پیر بابا علیہ الرحمۃ کی زندگی کے ہر گوشے کو سابقہ بزرگانِ کرام کے اقوال و احوال کی روشنی میں پرکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت پیر باباؒ کی ساری زندگی ترویج قرآن وسنّت کے لئے وقف رہی، انہوں نے اپنے اُسوۂ حسنہ کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ دن رات اُن کی تعلیم و تربیت کی، محبت اور شفقت سے انہیں دین کی طرف مائل کیا۔ اپنے کردار کی طاقت اور اخلاقی بلندی سے لوگوں کے دل رام کئے، جو اُن کے پاس بیٹھا، اٹھا انہی کے رنگ میں رنگا گیا اور اسطرح انہوں نے اپنے پورے ماحول کو متاثر کرتے ہوئے اپنے جوار میں ایک خوشگوار اسلامی انقلاب برپا کیا ــ ایسا انقلاب جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جاتے ہیں اور تا ابد

محسوس کئے جاتے رہیں گے۔

ان صوفیائے کرام اور خود حضرت پیر بابا کے قول و عمل سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ اہلِ تصوّف کا مقصدِ اعلیٰ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد پہ کاربند ہو کر اپنے نفس کو احکامِ شریعت کا اس قدر پابند بنانا ہے کہ خواہشات نفسانی کے آثار بالکل مٹ جائیں یعنی رفتہ رفتہ حقیقی اطمینان کی دولت سے فیض یاب ہو اور ذکرِ حق سے ذاتِ حق کی معرفت کی رسائی حاصل کر کے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ کی بشارت سے نوازا جائے

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ معجزۂ نبی اور کرامتِ ولی حق ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ نبی معجزہ کو ظاہر کرنے پر مامور ہے جب کہ ولی کے لئے کرامت کو چھپانا بہتر ہے۔ بقول حضرت مجدّد الف ثانی علیہ الرحمتہ کرامت معیارِ ولایت نہیں ہے۔ کرامت اور خرقِ عادت کے واقعات کے ظہور میں مسلمان اور دیگر مذاہب کے جوگی اور راہب وغیرہ مشترک ہیں۔ لہٰذا ولایت کا معیار کمالِ اتّباعِ سنّت میں ہے۔ شیخ المشائخ حضرت سیّد بہاؤالدین نقشبندؒ "الاستقامۃ فوق الکرامہ" کی تائید میں فرماتے ہیں ؎

ما برائے استقامت آمدیم نے پئے کشف و کرامت آمدیم

یعنی ہم کتاب و سنّت پر استقامت کے لئے آتے ہیں نہ کہ محض اظہار کشف و کرامت کے لئے۔

"خزینۃ المعارف" (ترجمہ ابریزہ از ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب) کے صفحہ ۵۸۸ پر نقل کیا گیا ہے کہ "جن لوگوں نے کراماتِ اولیاء کے متعلق کتابیں لکھی ہیں اگرچہ انہوں نے لوگوں کو اولیاء اللہ کی نشان دہی کر کے بڑا فیض پہنچایا ہے تاہم ایسی تالیفات سے جہاں عوام کو فائدہ پہنچا۔ وہیں انہیں بہت سا نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے اس لئے کہ انہوں نے صرف اولیاء اللہ کی کرامات کے بیان پر اکتفا کیا ہے

اور ان امورِ فانیہ کا ذکر نہیں کیا جو اولیا ء سے سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی

کتابوں کا پڑھنے والا کرامات ہی کرامات، تصرّفات ہی تصرّفات اور کشف اور کشف ہی دیکھتا ہے۔ تو ذہن میں یہ خیال جما لیتا ہے کہ ولی سے جس چیز کا بھی مطالبہ کیا جائے وہ اس کے پورا کرنے پر قادر ہوتا ہے، عاجز نہیں ہوتا — اور یہ کہ ولی سے کوئی مخالف شرع بات (خواہ بظاہر ہی میں کیوں نہ ہو) واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے عام قاری بڑے مغالطے میں پڑ جاتا ہے اور گمان کرنے لگتا ہے کہ ولی میں ایک خداوندی وصف پایا جاتا ہے اور وہ کسی بات کے کرنے سے عاجز نہیں ہوتا اور جو چاہے کرتا ہے۔

بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں کہ ولی میں معصوم ہونے کا وصف پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تو وصف نبوّت ہے۔ پہلا وصف، یعنی کسی چیز کے کرنے سے قاصر اور عاجز نہ ہونا محض خدا کا وصف ہے جو اولیاء اللہ تو کیا بڑے بڑے نبیوں کو بھی عطا نہیں کیا گیا۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں (انبیاء کو کبھی فتح نصیب ہونا کبھی شکست، کبھی دعاؤں کا قبول ہونا کبھی نہ ہونا وغیرہ)۔ دوسری بات ولی کو معصوم خیال کرنا ہے۔ حالانکہ یہ وصف صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ولایت کبھی نبوّت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ ولی کے ہاتھ پر جو خیر و برکت ظاہر ہوتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی برکت کی بدولت ہوتی ہے۔ ولی کی ذات تو عام لوگوں کی طرح ہوتی ہے جب کہ انبیاءِ کرام پیدائشی معصوم ہوتے ہیں۔ کہ وہ اللہ کی معرفت اور تقویٰ پر پیدا کئے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی شریعت کے تابع ہوتے ہیں نہ کسی استاد کے محتاج ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے اپنی کتابوں کو محض کراماتِ اولیاء کے ذکر تک محدود رکھا ہے اگر وہ ان میں امورِ صالحہ کے ساتھ امورِ قانیہ کا بھی ذکر کر دیتے تو لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ کبھی ولی کی دُعا قبول ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ کبھی وہ کسی بات کا

ارادہ کرتا ہے تو وہ بات پوری ہو جاتی ہے اور کبھی پوری نہیں ہوتی ۔ ولی میں ایک اور بات بھی ہوتی ہے کہ کبھی اس کے ظاہری اعضاء سے اطاعت کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی مخالفت کا (اگرچہ اس مخالفت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے) البتہ ولی کے اندر ایک کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے جو گناہ سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ گویا ولی محفوظ تو کہلا سکتا ہے، معصوم نہیں کہلا سکتا کہ معصوم ہونا صرف انبیائے کرام کا خاصہ ہے۔

بہت سے لوگ جب اولیائے کرام کے بارے میں اُن کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جو انتہائی وفورِ عقیدت کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ تو اپنے ذہن میں وہ تصویر بنا لیتے ہیں جو انہوں نے اُن سوانح عمریوں کے مطالعہ کے نتیجے میں بنائی ہو۔ پھر جب وہ بزرگان سلف کی کرامتوں کا موازنہ اور مقابلہ اپنے زمانے کے اولیائے کرام کے ساتھ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دَورِ حاضر کے اولیاء میں وہ کرامتیں موجود نہیں تو وہ شک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ بعض لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سرے سے انکار کرنے لگتے ہیں کہ اب بھی کوئی ولی موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے خیالی اور کلّی ولی کا تصوّر اور یقین کرنے لگتے ہیں جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ ایسے سادہ لوح لوگوں پر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ولایت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اپنے فلاں بندے کو اللہ تعالے نے منتخب کرلیا (بقول فرمان خداوندی اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ) یہ اللہ کی دین اور عنایت ہے، کیونکہ اس انتخابِ خداوندی کے لئے انسان کوئی ضابطہ مقرر نہیں کرسکتا۔ گویا ولایت بھی کسبی نہیں بلکہ وہبی چیز ہے اللہ جسے چاہتا ہے۔ اس نعمت سے نواز دیتا ہے۔

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں فاضل مؤلف نے اس اہم نقطۂ نظر کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور عام تذکرہ نگاروں کی طرح اس کتاب کو محض کشف و کرامات

کا مجموعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کتاب میں حضرت پیر بابا اور اُن کے متعلقین کے افکار و نظریات، ان کی اصلاحی مہم اور مبلّغانہ اور مجاہدانہ کارناموں کو عمدہ پیرائے میں بیان کرنے کی قابل ستائش سعی کی گئی ہے۔ کتاب کا مطالعہ مجموعی اعتبار سے قاری کے دل میں دین اسلام کے احیاء کی ضرورت، کتاب و سنت کی ترویج اور دین حق کی خاطر ایثار و قربانی کا جوش اور جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسی جوش و جذبے سے کام لے کر ہم آج کے پیش آمدہ مسائل سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اللہ کریم اُن تمام ساتھیوں کو جزائے خیر دے جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں حصّہ لیا۔

جزاھم اللہ احسن الجزاء

قاضی عبدالدائم دائم
سجّادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ
و مدیر اعلیٰ ماہنامہ "جامِ عرفان"
ہری پور ہزارہ)

مُقدّمہ

"میری جان کی قسم! اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے اور کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے تو بھی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ ہندوکش کے درمیان بسنے والے میں اسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جواں رہے گا۔"

نامور عرب مؤرخ اور مفکر امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں اہلِ سرحد کے اسلامی کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہ فخر بھی سرزمینِ سرحد کو حاصل ہے کہ یہاں کی اصل آبادی پختون، پشتون یا پٹھان سب کی سب مسلمان ہے۔ معروف دانش ور میر عبدالصمد خان مرحوم کی یہ وضاحت اس سلسلے میں قابل غور ہے کہ

"حقیقت میں پختون ایک ایسی قوم کا نام ہے جو کُلّہم مسلمان ہیں۔ اس قوم کی حقیقی تاریخ کا آغاز ظہورِ اسلام ہی کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہے۔ پختونیت اور اسلام کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ پختون اور مسلمان مترادف الفاظ بن چکے ہیں، جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سچا اور عظیم پختون ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑا اور سچّا مسلمان ہے۔

پشتو اکادمی پشاور یونیورسٹی کے رکن پردل خان خٹک پشتونوں (اہل سرحد) کے اس اسلامی کردار پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

" روئے زمین پر صرف اور صرف پختونوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ کوئی پشتون اسلام قبول

کئے بغیر اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا جو شخص دائرہ اسلام سے نکلا پشتون برادری سے بھی خارج ہوگیا۔ لہٰذا پشتون اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ انہوں نے اسلام کے پیغام اور تعلیمات کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا ہے۔"

جب بھی اسلام پر کٹھن وقت آیا یا کسی غیر مسلم طاقت نے مسلمانوں کو للکارا تو سرحدِ پاکستان پر آباد یہ غازی سربکف میدان میں اترے اور انہوں نے از سرِ نو مسلمانوں کو نئی قوت اور حوصلہ عطا کیا۔ "تذکرہ صوفیائے سرحد" کے مؤلف مولانا اعجاز الحق قدوسی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

"قریب تھا کہ وہ شمع جس کو عرب کے غازیوں نے برصغیر پاک و ہند کی وادیٔ سندھ میں روشن کیا تھا، داخلی اختلافات کی وجہ سے گُل ہو جائے کہ اچانک اسے خیبر کے راستے ایک نئی طاقت ملی اور پرچم اسلام اس سرزمین میں سرنگوں ہونے سے بچ گیا ــــ اس مرتبہ اس کا سہرا ان غیور و جسور افغانوں کے سر تھا جن کے رگ و ریشہ میں اسلام کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ ان کا ہر فرد شوقِ شہادت سے مست اور سرشار تھا۔"

حقیقت یہی ہے کہ کوہِ سلیمان کے درّوں کی راہ صرف فاتحین اور طالع آزما مجاہد ہی برّصغیر پاک و ہند میں وارد نہیں ہوتے رہے بلکہ ان لشکروں کے جلو میں بڑے بڑے علمائے دین، صوفیائے کرام، مبلغین عظام اور روحانی طبیب بھی آتے .... جنہوں نے ہندوستانی لوگوں کے اذہان اور معاشرے کے افکار و روایات کو بھی پوری قوت سے متاثر کیا، یہ لوگ اسلام کے مشعل بردار بن کر آئے اور انہوں نے سارے برصغیر کو اسلامی تعلیمات کی روشنی سے منوّر کر دیا۔ انہوں نے مقامی رسم و رواج، بدعات اور جاہلی تعصبات کا خاتمہ کیا اور لوگوں کے سامنے اسلامی کردار کا عملی نمونہ پیش کیا ــــ یہ صوفیائے کرام اور اولیاء عظام ایک سچے اسلامی معاشرے کے معمار تھے۔ وہ اللہ کے بندوں سے محبت کرنے اور ان کی بہتری اور بہبود کے طالب تھے، بقول حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا علیہ الرحمۃ "وہ لوگوں کی ارشاد و ہدایت

میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے عبادت کی طرف، نفسانیت سے روحانیت کی طرف متوجہ کرنے میں معروف رہتے ——— خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ ان کا نقطۂ نظر صلح اور خیر خواہی کا تھا۔" اللہ پاک کی ان برگزیدہ ہستیوں کی نگاہ بلند تھی اور افکار آفاقی تھے۔ وہ انسانیت کا درس دینے والے، زندگی کی اعلیٰ قدروں کا پرچم بلند کرنے والے اور انسانوں سے انتہائی محبت اور شفقت رکھنے والے لوگ تھے۔ اُن کے دروازے ہر چھوٹے بڑے، امیر، غریب پر کھلے ہوئے تھے، وہ معاشرے کے دھتکارے ہوؤں کو بھی گلے لگانے اور اُن کی فلاح و بہبود سے دلچسپی لینے والے لوگ تھے ایک غیر مُسلم کے قبولِ اسلام سے انہیں جتنی خوشی ہوتی شاید اس سے زیادہ خوشی ایک مُسلمان کے ترکِ گناہ سے ہوتی۔ ان کا نظام، نظامِ تربیت اور نظامِ صحبت تھا۔ ان کے ضمیر روشن تھے۔ اُن کی مجلس میں اُٹھنے بیٹھنے والے ہر شخص کا دل اس روشنی سے منوّر ہوتا۔ چراغ سے چراغ جلتے اور رفتہ رفتہ پُورا ماحول اور معاشرہ نیکی اور خیر کی روشنی سے منوّر ہو جاتا۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ برّصغیر میں اسلام زیادہ تر صوفیائے کرام ہی نے پھیلایا۔ صوبہ سرحد کے دور دراز پہاڑوں، گھاٹیوں، جنگلوں اور ویرانوں تک اسلام کی روشنی پہنچانے کا سہرا انہی صوفیائے کرام کے سر ہے، آج اگر صوبہ سرحد کے کونے کھدرے تک کے رہنے والوں میں اسلام سے والہانہ وابستگی، اسلامی شعار کی پابندی اور عقائد کی پختگی پائی جاتی ہے تو یہ انہی اولیاء اللہ کی مساعیٔ جمیلہ اور تجلّیات الٰہیّہ کا نتیجہ ہے ورنہ ان میں سے اکثر علاقے ایسے ہیں جہاں تک کسی مسلمان فاتح یا حملہ آور کے قدم نہیں پہنچے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو ان اولیاء اللہ کے کارنامے محیر العقول نظر آتے ہیں پشاور، تخت بھائی، شہباز گڑھ، منگورہ، ٹیکسلا اور دوسرے مقامات کے عجائب گھروں اور آثار قدیمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک وقت تھا جب اس سارے علاقے میں بودھ مت کا طوطی بول رہا تھا۔ چینی سیّاحوں کے کہنے کے مطابق پشاور سے سوات تک سڑکوں کے کنارے آبادیوں میں ہر وقت مندروں کی گھنٹیوں کی آواز فضاؤں میں گونجتی رہتی تھی۔ گویا ان سرحدی علاقوں کی ساری کی ساری آبادی مشرک، بت پرست اور

توہمات کا شکار تھی، پہاڑوں کے ایک ایک غار میں بت سجائے جاتے تھے، بت تراشی کا کام یہاں انتہائی عروج پر تھا اور آج بھی فن کے شیدائی گندھارا آرٹ کو مجسمہ سازی کا کمال فن قرار دیتے ہیں مُشتے نمونہ از خروارے کیلاش اور کافرستان کی تہذیب اور وہاں کے لوگوں کی مذہبی رسوم اور عجیب وغریب عقائد اور دستوریں آج بھی ان کوہستانی علاقوں کے قدیم باشندوں کی زندگی اور رہن سہن کی جھلک دکھائی دیتی ہے ـــــ آخر یہ عظیم الشان فکری اور ذہنی انقلاب ان علاقوں میں کیسے رونما ہوا؟ ـــــ وہ کون ہستیاں تھیں جن کی کوششوں کے نتیجے میں یہ مبارک اسلامی انقلاب برپا ہوا؟ ـــــ یقیناً وہ صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ہی تھے جن کو اللہ نے یہ سعادت بخشی کہ انہوں نے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا۔ انہیں کفر کی تاریکیوں سے نکال کر اسلامی تہذیب کی برکتوں سے مالامال کر دیا ـــــ انہیں اس خوبی سے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا کہ صدیوں گذر جانے پر بھی یہ لوگ اسلام کے اسی طرح شیدائی ہیں اور اللہ اور اللہ تعالےٰ کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سربلندی کے لئے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانی دینے پر ہر وقت تیار اور مستعد نظر آتے ہیں۔

صوبہ سرحد کے ان سرحدی اور کوہستانی علاقوں تک اسلام کا روح پرور پیغام پہنچانے کی اولیت کا سہرا غوثِ خراسان۔ قطبِ زمان، اعلیٰ حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا بونیری رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے۔

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کا دینی اور تبلیغی کارنامہ اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اس کے اثرات اور ثمرات آج تک جاری وساری ہیں، ان کی عزت وعظمت وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گھٹنے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے اُن کا حلقۂ ارادت وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور ان کی شہرت زمان ومکان کے تقاضوں سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے، سوات، بونیر، کوہستان اور ہزارہ سے لے کر وزیرستان کے مقامات ٹانک، وانا اور جنڈولہ تک اور خیبر کے درّے سے مارگلہ کی پہاڑیوں تک ہر جگہ ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ اَن پڑھ اور اُجڈ دیہاتی بھی ان کے نام

کا احترام کرتا اور ان کا وظیفہ پڑھتا ہے، عرس کے دنوں میں بسوں اور ٹرکوں پر، کاروں اور ویگنوں پر، قافلوں اور ٹولیوں کی صورت میں سرخ اور سبز جھنڈے اٹھائے ہوئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ باجا کلی بونیر کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی جوش اور جذبے سے حضرت پیر باباؒ کے مزار پر پہنچ کر نذر و نیاز گذارتے، —— مزار شریف سے ملحقہ مسجد میں نفل ادا کرتے اور ذکر و فکر میں محو نظر آتے ہیں۔ سارے صوبہ سرحد اور مشرقی افغانستان میں شاید ہی کوئی شیدائی اسلام ایسا ہو جو حضرت پیر باباؒ کے نام نامی اور ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔

حضرت پیر باباؒ کے کمالات کا اس لئے بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے کوہستان کے ان کونوں کھدروں تک بھی اسلام کا پیغام پہنچایا جہاں کسی دوسرے مبلّغ اسلام یا فاتح کے قدم نہ پہنچ سکے۔ جن لوگوں نے کوہستان کے یہ علاقے دیکھے ہیں یا جو پہاڑی سلسلوں سے گھرے ہوئے ان دور دراز اور دشوار گذار علاقوں کی جغرافیائی پوزیشن کا علم رکھتے ہیں، وہ وہاں کے لوگوں کی پسماندگی، لاعلمی، افلاس و ناداری اور توہم پرستی سے پوری طرح آگاہ ہیں، ان لوگوں میں تبلیغ و اصلاح کا پرچم بلند کرنا اور انہیں صراطِ مستقیم دکھانا حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ جیسے عالی حوصلہ اور پُرعزم بزرگوں ہی کا کام ہے اس اعتبار سے حضرت پیر باباؒ کو ان کی انسانی دوستی اور خدمتِ خلق کے پیشِ نظر "مُصلحِ اعظم" تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت شہنشاہ خراسان پیر سید علی غواصؒ نے کچھ اس شان سے لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منوّر کیا اور کچھ ایسے انداز سے انہیں راسخ الاعتقادی اور خود اعتمادی سے نوازا کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی دین کی راہ پر ان کے قدم ڈگمگانے نہ پاتے، ان علاقوں کے لوگ نہ صرف ان کی ارادت اور عقیدت کو گلے لگائے رہے بلکہ مسلکِ ابوحنیفہ (اہل سنت والجماعت) پر کاربند رہے، کوئی دوسرا مذہب ان سارے علاقوں میں جڑ نہ پکڑ سکا۔

اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ بونیر کے لوگ حضرت پیر بابا کے وہاں پہنچنے سے پہلے کن مذہبی عقائد کے پیروکار تھے تاہم غالب قیاس یہی ہے کہ کیلاش کافرستان اور دوسرے علاقوں کی طرح وہ اس وقت تک شجر و حجر پرستی کے چکر میں گرفتار تھے۔ قبیلے قبیلے کا مسلک جداگانہ تھا اور یہ عین ممکن ہے کہ اپنی جہالت اور پسماندگی کی بدولت وہ محض لامذہب ہی ہوں اور الگ تھلگ زندگی گذارنے کے باعث اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں ہی پر کاربند ہوں، اس پس منظر میں حضرت پیر بابا کی تبلیغی مساعی کی قدروقیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دلوں کو ایمان کی روشنی بخشنے اور انہیں تہذیب و تمدن کے نور سے منور کرنے پر انہیں اپنے دور کا "مصلح اعظم" تسلیم کئے بغیر بن نہیں پڑتی۔

حضرت پیر بابا کی مشکلات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو سرحدی علاقوں کی قبائلی خصوصیات سے آگاہ ہوں، یہ لوگ صدیوں سے الگ تھلگ زندگی گذارتے چلے آرہے ہیں اور تاحال موجودہ تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت سے قریب قریب بالکل بے بہرہ ہیں۔ یہ لوگ یا تو بھیڑ بکری پال کر گذران کرتے ہیں۔ جہاں ممکن ہو پہاڑیوں کو کاٹ کر کھیت بناتے اور جو، جوار اگاتے ہیں۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر علاقہ دوسرے علاقے سے الگ تھلگ ہے، پہاڑی ندی نالوں کی کثرت کی وجہ سے راستے دشوار گذار ہیں اور علاقہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ ہر علاقے تک پہنچنا اور ہر جگہ لوگوں تک پیغام محمدیؐ پہنچانا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ دوسرے کا دشمن اور ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ لوگ نوشت و خواند سے بے بہرہ ہیں، اس دور میں نہ اخبار تھے نہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن —— ان سارے مواقعات اور ان ساری مشکلات کے باوجود پیر بابا عزم و ہمت کا پہاڑ بنے رہتے ہیں۔ وہ فقیر تھے نہ کہ بادشاہ —— فقیر مادی وسائل سے محروم ہوتا ہے اور محض روحانی اور اشراقی قوتوں سے کام لیتا ہے، وہ خود اپنی ذات کو لوگوں کے سامنے ایک نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے

اس کی زبان پر اللہ کا بابرکت پیام ہوتا ہے اور اس کا دِل تجلّیات الٰہیہ کا مسکن و مرکز
یقیناً جوبات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ـــــ یہ حضرات کتابیں نہیں لکھتے
انسانوں کی سیرت سازی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، انہیں کاغذ، قلم، دوات کی حاجت
نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے خونِ جگر سے گلشنِ انسانیت کو سیراب کرتے ہیں۔ ان کی
کوششوں اور اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم سے خزاں زدہ انسانیت بہار آشنا ہوتی ہے' وہ ابرِ کرم کی
مانند برستے ہیں تو بنجر زمینیں بھی ثمر بار اور گُل بکنار ہو جاتی ہے۔

ایک عام انسان اپنے آپ کو ماحول میں گم کر دیتا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگا
جاتا ہے لیکن مردانِ حق زمانے اور حوادثِ زمانہ کا رُخ پلٹ دیتے ہیں۔ وہ ماحول کو
متاثر کرتے اور اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں ـــــ دیکھا
جائے تو اسلام ایک طرح کا نظامِ صحبت اور نظامِ تربیّت ہی تو ہے۔ اس نظامِ صحبت میں
مرکزی نقطہ خود پیغمبرِ اسلام، سید الانام، خاتم النبیّین، رحمۃ للعالمین جناب محمدؐ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کی سیرت مطہرہ اور اُسوہٗ حسنہ ہے۔ اسلام کی تاریخ اس حقیقت
پر شاہد ہے کہ جتنا کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیادہ قریب رہا۔ اُن کے رنگ
میں زیادہ رنگا گیا اور شیدائیانِ حق نے اسی طریقِ نبوت کو اپنایا۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ پر
عمل شروع کیا۔ ان ہستیوں کے اخلاقِ فاخرہ کو دیکھ کر لوگ خود ان کی طرف کھنچنے لگے۔
ان اہلِ محبّت نے لوگوں کے دلوں میں عشقِ رسول اور اطاعتِ الٰہی کی شمعیں روشن کیں
ـــــ لوگوں سے ترکِ گناہ کی بیعت لی۔ اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیّت کی، نفوس کا تزکیہ ہوا
تو اصلاحِ اُمّت خود ظہور میں آتی گئی، لوگ ذات پات' اونچ نیچ، طبقاتی کش مکش' قبائلی
اور گروہی عداوتوں اور تعصّبات کو بھول کر اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت کی طرف
متوجہ ہوتے گئے - جاہلی رسوم و رواج کا خاتمہ ہوا، کفر اور شرک کی ظلمتیں چھٹ گئیں،
توحید و رسالت کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوا۔ ساری فضا اور سارا ماحول نورِ ایمانی سے
منوّر ہو کر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ صوبہ سرحد کے کوہستانی علاقوں میں پیر بابا، سیّد علی

غواص ترمذی علیہ الرحمۃ اللہ والوں کے اسی قافلۂ خدامست کے سرخیل تھے جو تمام مقاصد دینوی سے قطع نظر کرکے انتہائی بے غرضی سے محض ذکرِ خدا اور عشق و اطاعت رسولؐ کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے اور صدق وصفا اور سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر کاربند ہوجاتا ہے —— ان حضرات کرام کے نزدیک تصوّف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب وسنت میں انتہائی سعی کی جائے، اسوۂ رسولؐ وصحابہ کرامؓ کو دلیلِ راہ سمجھا جائے۔ اوامر و نواہی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات وعبادات کو مقصودِ حیات سمجھا جائے۔ قلب کو محبّت اور تعلق ماسوا سے پاک کیا جائے۔ نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور حسن معاملت اور تزکیہ باطن کے حصول میں جہد وسعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے پائے۔ خلوص اور محبت کے دو الفاظ تصوّف کی روح ہیں —— ظاہر کی بجائے صوفیائے کرام نے باطن کی طہارت پر زور دیا —— کیونکہ باطن متاثر ہو تو انسان کے افکار میں انقلاب آجاتا ہے اور افکار کا انقلاب ہی عملی انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے، ایک چیز صرف قبولِ اسلام ہے اور ایک ایمان کا دلوں میں اتارنا ہے —— ایک مسلمان ہونا ہے اور ایک مومن ہونا —— حضرت پیربابا علیہ الرحمۃ اور حضرات صوفیہ کا کام لوگوں کو قلب ونظر کی روشنی بخشنا اور ان کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرکے انہیں اسلام کی سیدھی راہ پر ڈال دینا ہی تو تھا۔

آج کل تصوّف اور فقر کا نام لیتے ہی ذہن کسی تارک الدنیا، گوشہ نشین، زاہدِ خشک کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ ماڈرن ذہن ایسے "تصوّف" سے "الرجک" ہے لیکن اس ماڈرن ذہن" کو کون سمجھائے کہ اہل اللہ تو عام لوگوں سے زیادہ فعال اور عملی ہوتے ہیں —— ان کا اسلام عملی اسلام ہوتا ہے، ان کے پیش نظر خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔ حضورؐ کی زندگی میں غارِ حرا کی تنہائیاں، مراقبے اور مجاہدے بھی ملتے ہیں۔ خود کئی کئی دن تک بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلانے کی مثالیں بھی موجود ہیں، سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دینے کے واقعات بھی ہیں اور بدر وحنین کے خونی معرکوں

میں سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے ہی خون میں نہانا بھی ہے ـــــ مختصراً اللہ تعالیٰ اور رسول خداؐ کے احکام اور منشار کے عین مطابق زندگی بسر کرنا ہی اہل اللہ کا مقصود اور نصب العین ہے۔ خلوت و جلوت، سفر و حضر، تونگری اور ناداری، خوشی اور غم ہر حالت میں اللہ پاک کی ذات پر بھروسہ رکھنا اور اسلام کا دامن تھامے رکھنا ہی رُوح ایمان اور روحِ تصوّف ہے

بات صرف اتنی ہے کہ طریقت و شریعت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ میں کوئی لفظ اور کوئی خطاب صحابی سے بڑھ کر نہ تھا اور صحابی کا شرف اسی میں تھا کہ وہ حضور انورؐ کی صحبت اور تربیت سے فیض یافتہ تھے۔ ان کے بعد صحابیوں کے صحابیوں کے لئے تابعین کا نام تجویز ہوا۔ پھر ان کی آنکھیں دیکھنے والے تبع تابعین کہلاتے ـــــ بعد میں اہل سنت کے طبقۂ خاص نے جو ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتا اور اسوۂ رسولؐ پر کاربند رہنے کی سعی کرتا اپنے لئے اہل تصوف کا اصلاحی نام اختیار کیا ـــــ گویا مینائے تصوّف اور دولتِ ایمان و عرفان دست بدست آگے بڑھتی رہی اور ہر زمانے اور ہر دَور میں اللہ والوں کا ایک گروہ ایسا رہا جس کا نصب العین اشاعت و تبلیغ دین رہا۔ کوئی دَور اِن حضراتِ کرام سے خالی نہیں گذرا ـــــ تصوّف ایک اشراقی طریق کار ہے جس کی بدولت مرشد کے قلب سے اٹھنے والی روشنی مُرید کے دل کو منوّر کرتی اور اُسے عشقِ الٰہی کی لذت عطا کرتی ہے۔

رہا یہ کہ صوفیاء کی ضرورت کیا ہے؟ - تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہر فن اور ہر شعبہ علم کی تحصیل کے لئے استاذ کی ضرورت ناگزیر ہے۔ روحانیت کے علم میں، جو ان تمام علوم سے بالاتر ہے، اُستاذ مرشد اور رہبر کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے ـــــ ایک عام استاد کا کام شاگرد کو ظاھری علوم سے آراستہ کرنا ہے جب کہ شیخ طریقت (بقول مفسرین قرآن علمائے حقانی)

- - - - - - - - - وہ مُصلح ہوتا ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں کی فطری صلاحیّت کو ابھار سکے پس مُرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس

کے سوا کچھ نہیں کہ جس ہستی کے صالح و صادق ہونے پر بھروسہ ہو اور جس کی شانِ طاعت و تقویٰ سے اپنا ضمیر و وجدان مطمئن ہو، اس کے اتباع کا قصد و اہتمام کیا جاتے اور اطاعت و نیازمندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دی جائے۔"

گویا شریعت اور طریقت کوئی جُدا جدا عمل نہیں —— اور شریعت کے نقطۂ کمال ہی کا نام طریقت ہے۔ ظاہری عبادات کے ساتھ ساتھ اگر قلب و باطن نورانیت سے منوّر ہوں تو عبادات میں جو لذّت اور کیف و سرور ملتا ہے اس کا اندازہ صرف اہل محبّت ہی لگا سکتے ہیں۔ پیر و مرشد کا قلب چونکہ واسطہ در واسطہ، سلسلہ بہ سلسلہ مُرشد کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک سے جڑا ہوتا ہے اس لئے اس کا طریقِ تعلیم و تربیت زیادہ مؤثر اور مفید ہوتا ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس اُمّت میں ہر دَور اور ہر زمانہ میں ایسی کامل ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جو لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی رہیں —— ان حقیقی نائبانِ رسول ؐ اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دَور میں موجود رہے اور عامۃ المسلمین ان سے فیض پاتے رہے —— ضرورتِ بیعت اور نظامِ طریقت کے بارے میں عظیم مفکر اور دانشور حضرت شاہ ولی اللہؒ رسالہ "القول الجمیل" میں رقم طراز ہیں کہ

"بیعت سنّت رسول اللہ ؐ ہے اور بیعت کا اطلاق صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں مثلاً بیعتِ خلافت، بیعت جہاد اور بیعتِ توبہ —— صوفیاء کی مروجہ بیعت بیعت تقویٰ میں داخل ہے"

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی شریعت اور طریقت کی ہم آہنگی اور یگانگت کو یوں واضح کرتے ہیں کہ ؎

شریعت در محفلِ مصطفےٰ ؐ | طریقت عروجِ دلِ مصطفےٰ ؐ
عبادت سے عزت شریعت میں ہے | محبّت کی لذّت طریقت میں ہے
شریعت میں ہے صُورتِ فتحِ بدر | طریقت میں ہے معنیِ شقِ صدر

شریعت میں ہے قیل و قال احبیب　　طریقت میں حسن و جمالِ حبیبؐ
نبوّت کے اندر ہی ہیں. دونوں رنگ
عبث ہے یہ مُلّا و صوفی کی جنگ

گویا تصوّف ایک مزاج اور طریقِ عمل کا نام ہے جس کا آغاز غارِ حرا ہی سے ہوگیا تھا. خود احباب و اصحاب نبیؐ میں کئی جلالی شان کے مظہر تھے تو کئی جمالی مزاج رکھنے والے. علمائے اسلام میں واعظ، مبلّغ اور معلّم بھی اُسی طرح قابلِ احترام ہیں جس طرح اہل محبّت صوفیاء و اتقیاء ـــــــ دونوں کا مقصد قولاً، فعلاً اور حالاً ہر حیثیت سے اتباعِ رسول مقبولؐ ہی رہا۔ صُوفی کی مختلف تعریفیں کی گئیں اور کی جا سکتی ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ" صوفی وہ ہے جس نے اپنے باطن اور ظاہر کو قرآن اور سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متابعت کے ذریعے پاک و صاف کر لیا ہو "

حضرت ابوالحسن نوریؒ کے الفاظ میں "تصوف تو نام ہی حُسنِ اخلاق کا ہے" ـــ ابوالحسن قنا د علیہ الرّحمۃ اسی نقطے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ" جو لوگ کدورتِ بشریت سے پاک صاف کر دیئے گئے، صوفی کہلائے"

مُصلح اعظم شہنشاہِ خراسان، مبلّغ رفیع الشان حضرت سیّد علی غواص المعروف پیر بابا صاحب علیہ الرّحمۃ بھی ایک عظیم صوفی اور عالم با عمل تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد، آزاد قبائل اور افغانستان کے مُسلمان عوام کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی، سیّد عبدالجبّار بادشاہ کے مطابق "وہ "قطبیت اور غوثیت کے مدارج عالیہ پر فائز تھے اور عام لوگوں سے پابندیٔ شریعت کی بیعت پر اکتفا کرتے تھے جب کہ علماء اور اہلِ تقویٰ سے بیعتِ طریقت لیا کرتے تھے۔ ان کا دائرہ اثر اور دائرہ فیض بہت وسیع تھا اور اپنی اپنی بساط اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہر کوئی ان سے فیض یاب ہوا اور کوئی بھی آنے والا محروم ہرگز نہ رہا" یہ اعزاز بھی اولیائے سرحد میں سے پیر باباؒ ہی کو حاصل ہوا کہ عالم فاضل لوگ بھی

ان سے رجوع ہوتے، وہ نہ صرف ان کی تعلیم و تربیت کی بدولت ظاہری اور باطنی علوم سے بہرہ ور اور آراستہ ہوتے بلکہ پیر باباؒ کے انہی ارادت مندوں کی بدولت اس سرزمین کے عوام تک اسلامی تعلیمات کی روشنی پہنچی ــــــ "سلسلہ سلوک میں آپؒ کے مریدوں کے متعدد سلسلے ہیں جنہیں اکثر اخون خیل کہا جاتا ہے۔ ان میں پیر باباؒ کے ماذون و خلیفہ مجاز حضرت اخون درویزہؒ کا نام سرفہرست ہے جو اپنے عہد کے متشرع مجاہد اور ولی اللہ ہو گذرے ہیں۔ علاوہ بریں اسی ضمن میں اخون پنجو صاحبؒ اور اس لڑی میں اخون درویزہؒ کے فرزند اخون شہیدؒ، اخون سالاکؒ، اخوند عمرؒ، اخوند جیؒ اور اخوند اللہ داد کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی اولاد اخوند خیل کہلائی اور انہوں نے علم دین کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

پشتو ادب و زبان کی خدمت

حضرت پیر باباؒ اور بالخصوص ان کے خلفاء اور اخلاف نے اپنی سرگرمیاں صرف خدمت دین تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ انہوں نے پشتون عوام تک اسلام کا پیغام اُنہی کی زبان میں پہنچانے کے لئے پشتو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس سے پیشتر پشتو کو ایک کم مایہ زبان سمجھا جاتا تھا اور تحریری سرمایہ صرف فارسی اور عربی ہی میں موجود تھا۔ حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ خود بھی عالم فاضل انسان تھے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہوں تاہم وہ کتابیں اب ناپید ہیں۔ البتہ اُن کے خلیفہ خاص حضرت اخون درویزہ کی تصانیف پشتو نثر کی اولین تحریروں میں شمار ہوتی ہیں۔

شمس العلماء میر احمد شاہ رضوانی "بہارستان" میں اخون درویزہ باباؒ کی ادبی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اخون درویزہ پشتو ادب کے محسنین میں سے ہیں۔ انہوں نے پشتو زبان کے ارتقاء میں غیر معمولی حصہ لیا اور پشتو میں کتابیں لکھ کر اس زبان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اسی لئے ان کا نام پشتو زبان کے خدمت گذاروں میں ہمیشہ عقیدت سے لیا جائے گا۔"

مشہور محقق عبدالحئی حبیبی کے مطابق "اخون درویزہؒ ایک آتش بیان خطیب، اثر انگیز مؤلف اور نہایت سخت گیر محتسب تھے۔ پشتو، فارسی اور عربی میں تقریر کرتے تھے۔ شعر کہتے

تھے اور ان کا طریقۂ وعظ بڑا موثر تھا۔

اخون درویزہ پشتو نثر کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کے استاد تھے۔ وہ خاص طرز کے بانی ہیں۔ سبھی ان کی اس طرز کو اپنانے میں کوشاں رہے یہاں تک اُن کے حریف بایزید انصاری (پیر روشن یا پیر تاریک) کے پیروؤں میں بھی اُن کی طرزِ نگارش نے رواج پایا۔ اس بنا پر پشتو ادب کی تاریخ میں نہ صرف اخون درویزہ بلکہ ان کے شاگرد اور ان کے خاندان کے افراد بھی بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں فارسی اور اُردو زبان کی اشاعت اور فروغ میں صوفیائے کرام نے نمایاں حصہ لیا وہیں پشتو زبان و ادب میں اخون درویزہ باباؒ اور دوسرے صوفیا بھی پیچھے رہنے نہ پائے۔ "مخزن اسلام" "تذکرۃ الابرار والاشرار" "ارشاد الطالبین" اور "شرح قصیدہ امالی" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

چونکہ پیر بابا سید علی غواص ترمذیؒ، حضرت اخون درویزہؒ اور ان کے مخالفین بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں میں اکثر مناظرے پشتو میں ہوتے تھے اس لئے لوگ پشتو نظم و نثر کی طرف متوجہ ہوتے جہاں اخون درویزہ کے ساتھیوں اور مریدوں میں سے اکثر نے پشتو کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہیں بایزید انصاری کے مریدوں میں مُلّا ارزانی اور اس کے بھائیوں مُلّا عمر اور مُلّا علی نے پشتو شعر و ادب کو اپنی تحریروں کی بدولت مالا مال کر دیا۔ اسی گروہ میں مخلص اور میرزا خان انصاری جیسے شعراء بھی ہوئے۔

اخون درویزہ نے اپنی کتاب "تذکرۃ الابرار والاشرار" میں مُلّا ارزانی کی عقل و فہم اور قابلیت کی ستائش کی ہے بلکہ اخون درویزہ کا خیال ہے کہ "خیرالبیان" کی تحریر میں ارزانی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ارزانی خود اپنے اشعار میں "خیرالبیان" کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ فقیر کا پشتو دیوان ہے، یہ دیوان حقانی دسترخوان ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ چار زبانوں میں لکھا گیا ہے ۔۔۔۔"

ایک اور جگہ ارزانی کہتا ہے کہ "فقیر کی پشتو باتیں موتی جیسی آبدار ہیں ۔۔۔"

مختصراً حضرت پیر بابا سیّد علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے وابستگانِ دامن نے مسلمان عوام میں دینی روح بیدار کرنے ان کے اخلاق کو سنوارنے اور اُن کی اصلاحِ باطن کے لئے بھرپور کوششیں کیں اور صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اسلامی تعلیمات کے فروغ میں نمایاں حصّہ لیا۔

نامور اخلاف

یہ شرف بھی حضرت پیر بابا رح کو حاصل ہوا کہ ان کی اولاد میں ہر دور میں وہ نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے کارناموں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فخر کیا جاتا رہے گا۔ ان میں سے اکثر حضرات تو روحانی اصلاح کے علمبردار رہے جن کی سرگرمیاں منبر و محراب اور اصلاح و تبلیغ کے لئے وقف رہیں اس لئے ان کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں بار نہ پاسکے تاہم پیر بابا علیہ الرحمۃ کی مبارک لڑی میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں دینی سیادت کے ساتھ ساتھ شمشیر و سنان سے کام لیتے ہوئے دشمنانِ اسلام کے خلاف شاندار کارنامے بھی انجام دیئے۔ اس عظیم خانوادہ کی عظیم ہستیوں میں سے سیّد اکبر شاہ، سید مُبارک شاہ، سیّد عبدالجبار بادشاہ اور سیّد السادات، حضرت جمال الدین افغانی کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

سیّد اکبر شاہ ترمذی

سوات، بونیر، شمالی ہزارہ اور صوبہ سرحد کے اکثر دور افتادہ مقامات ایسے ہیں جو کبھی کسی بیرونی طاقت کے غلام نہیں رہے، یہ لوگ ہمیشہ آزادی کی نعمت سے سرفراز رہے، مغلوں کے ابتدائی دور میں ان کا برائے نام الحاق دہلی دربار سے ضرور تھا تاہم اندرونی طور پر وہ اس وقت بھی اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہی تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغلیہ سلطنت پر زوال آیا تو یہ برائے نام وابستگی بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ ہر جگہ کا خان خود مختار حکمران بن بیٹھا اور اپنی من مانی کرنے لگا۔ سکھوں کے دور میں ان علاقوں کی ابتری طوائف الملوکی اور انار کی انتہا کو پہنچ گئی ـــ کوئی مرکزی اقتدار نہ رہا۔ ہر طرف قتل مقاتلوں خون خرابوں اور خانہ جنگی کا عالم تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔ ایسے میں حضرت

پیر بابا ؒ کی اولاد نے بڑا کام کیا۔ اپنے روحانی اثرونفوذ کی بناء پر وہ ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، جہاں کہیں اور جب کبھی دو قبیلوں میں ٹھن جاتی یہی سادات ترمذی بیچ میں آتے اور ثالث بن کر ان میں صلح کرا دیتے۔

سکھوں نے ہزارہ پر کچھ عرصہ حکومت کی لیکن اس سارے عرصہ میں انہیں حد سے مجاہد اور حریت پسند قبائل سے متواتر معروف جنگ رہنا پڑا ــــــــ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود کئی بار ہزارہ کا رُخ کیا۔ اُسے وقتی طور پر کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں لیکن وہ بھی کوئی مستقل حکومت یہاں قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر مشہور سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی شکست کے بعد تو سکھوں کا یہ برائے نام اقتدار بھی ختم ہو گیا ــــــــ یہ وہ وقت تھا جب ایک طاقت (سکھ) ختم ہو چکی تھی اور دوسری طاقت (انگریز) میں ابھی اتنی سکت نہ تھی کہ زمامِ اختیار سنبھال کر امن و امان بحال کیا جاتے۔ ایسے میں ہزارہ کے مسلمان قبائل نے بہت بڑا اور نمائندہ جرگہ بلایا اور علاقے میں پہلی شرعی حکومت قائم کرنے پر اتفاق ہو گیا ــــــــ اس وقت بھی لوگوں کی نظر حضرت پیر بابا ؒ کے نامور جانشین سید اکبر شاہ ترمذی آف ستھانہ پر پڑی، انہوں نے اتفاق رائے سے انہیں علاقے کا بادشاہ اور امیر شریعت منتخب کر لیا۔ اسی جرگے میں نواب خان تنولی رئیس شنگڑای اور غلام خان ترین رئیس درویش کو وزیر اور سیف اللہ خان رسالدار کو میر منشی مقرر کیا گیا ــــــــ یہ اس علاقے میں پہلی اسلامی اور جمہوری حکومت تھی ــــــــ انگریز کی آمد (۱۸۴۹ء) تک یہ حضرات ہی علاقے کا نظم و نسق چلاتے رہے۔ تاہم یہ صورتِ حال چونکہ تھوڑے ہی عرصے تک قائم رہ سکی اس لئے مقامی لوگ اس دور کو "لنڈے مسلمانی" یا "مختصر عرصہ کی اسلامی حکومت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سادات ستھانہ کے اس خانوادہ کی تاریخ عزم و شجاعت کی تاریخ ہے، مدتوں تک ستھانہ جنگِ آزادی کا بہت بڑا مرکز رہا اور انگریز اپنی تمام قوت اور وسائل کے باوجود سید اکبر شاہ ترمذی اور مجاہدین ستھانہ کے نام سے لرزہ براندام رہے، یہاں تک کہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں بھی فرنگی کی افواج کے ہندوستانی سپاہیوں نے کسی جگہ کو اپنا مرکز بنایا تو وہ ستھانہ ہی تھا۔ البتہ مجاہدینِ آزادی کی بدقسمتی اور انگریز کی خوش قسمتی سے سید اکبر شاہ بادشاہ کا انتقال عین اسی دن ہوا جب میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے فرنگی کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا چنانچہ ان کی وفات پر پشاور کے انگریز کمشنر سر ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا کہ

" اس وقت اگر مجاہدوں کا سربراہ اکبر شاہ زندہ ہوتا تو صورت حال کچھ اور ہوتی "۔ ــــــ

یہی نہیں کہ سید اکبر شاہ ترمذی کو ہزارہ کے قبائل نے متفقہ طور پر اپنا بادشاہ چنا بلکہ جب بعد میں سوات بونیر اور نواحی علاقوں میں بھی سیاسی صورت حال ابتر ہوئی اور مختلف سرحدی قبائل آپس ہی میں مشت وگریبان رہنے لگے تب بھی ستھانہ کے سادات ترمذی کا یہی گھرانہ کام آیا ــــ اُن دنوں اخون صاحب سوات حضرت عبدالغفور باباؒ ان علاقوں کے روحانی تاجدار تھے، تمام لوگ ان کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کیا کرتے تھے۔ اخون صاحبؒ نے ان تمام علاقوں کے قبیلوں کا ایک نمائندہ جرگہ بلایا، چونکہ وہ خود دنیوی جاہ وجلال کو پسند نہ کرتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی طرف سے سید اکبر شاہ ترمذی کا نام نامی علاقے کے بادشاہ کے طور پر تجویز کیا ــــ تمام قبائلی سرداروں اور نمائندوں نے اخون صاحب سے اتفاق کیا اور سید اکبر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔ سید اکبر شاہ ترمذی قابلیت اور شجاعت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، جمعیت مجاہدین کے پانچسو سے زیادہ سرفروش ان کے ادنیٰ اشارے پر جان تک کا نذرانہ پیش کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنا ایک رسالہ تیار کیا، جہاں بھی کوئی گڑبڑ ہوتی یہ سوار بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہاں پہنچ جاتے اور غلط کاروں کو سزا دیتے۔ اس طرح سید اکبر شاہ بادشاہ کی کوششوں سے سارے علاقے میں امن وامان قائم ہوگیا ــــ وہ اپنی وفات (۱۸۵۷ء) تک سوات اور بونیر کی بادشاہت کے منصب پر فائز رہے۔

ان کے بعد ان کے بیٹے سید مبارک شاہ اور پوتے سید فیروز شاہ نے بھی سیاسیات سرحد میں نمایاں کردار انجام دیا۔

ستھانہ اور سادات ستھانہ کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب "سرگزشت مجاہدین" میں لکھتے ہیں۔

" اٹھارویں صدی عیسوی میں سید ضامن شاہ نے اس گاؤں کو آباد کیا۔ چونکہ سادات کا یہ گھرانا بڑی عزت و احترام کا مالک تھا، اس نئے گاؤں کو "آستانہ" یا "آستانہ سادات" کہا جاتا تھا، جو بگڑ کر ستھانہ بن گیا۔ ستھانہ کا اصل قصبہ دریائے سندھ کے کنارے تھا لیکن ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں خوفناک سیلاب آیا جس سے قدیم ستھانہ برباد ہو گیا۔ موجودہ ستھانہ دریا سے کافی دور بنایا گیا"

قاضی میر عالم آف سکندر پور ہزارہ (جو انگریزی کی عملداری کے ابتدائی دور میں اسسٹنٹ کمشنر تھے) ایک خط میں، جسے "تاریخ ہزارہ" کے مؤلف ڈاکٹر شیر بہادر خان نے نقل کیا ہے کہ

" سادات ستھانہ ترمذی سید ہیں اور بونیر کے پیر بابا علیہ الرحمتہ کی اولاد ہیں۔ یہ لوگ آج کل منگل تھانہ، تختہ بند وغیرہ علاقہ غیر (آزاد قبائل) میں آباد ہیں۔ تاہم ان کی ایک شاخ صوابی، امیرا اور گندف میں بھی سکونت پذیر ہے سادات ستھانہ کی شہرت سید اکبر شاہ کے زمانے میں انتہائی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔"

ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے سادات ستھانہ کے بارے میں ۷ا اپریل ۱۸۶۸ کو لکھا کہ

" بہت سال ہوتے سرکار انگریزی کی سرحد کے قریب سادات کے چند گھرانوں نے، جن کے گرد پنجاب، سرحد اور پٹنہ بہار کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے ستھانہ کی بنیاد رکھی۔ ان کی کل تعداد پانچسو کے قریب تھی ۔۔ یہ گاؤں سرکار انگریزی کے خلاف "فتنہ انگیزی" (جہاد) کا مرکز تھا اور سرکار انگریزی کے

کے علاقہ کے "جرائم پیشہ" اور دوسرے لوگوں کے لئے جائے پناہ!
سید اکبر ان کا سرغنہ تھا جو بعد میں سوات کا بادشاہ بنا اور ساوائل ۱۸۵۷ء
میں فوت ہوگیا۔
صوبہ سرحد کا ایک سابق انگریز گورنر سراولف کیرو اپنی کتاب "پٹھان" میں سید اکبر شاہ
بادشاہ کے بارے میں رقم طراز ہے کہ۔

"سید اکبر سکھوں کے خلاف یوسف زئی لڑاکوں کا قائد تھا (یہ معرکہ نوشہرہ
کے قریب دریائے کابل کے بائیں کنارے پیر سباک کے مقام پر ۱۸۲۴ء میں
ہوا) سکھوں کے دور میں سید اکبر نے بڑی شہرت اور طاقت پائی۔ ہزارہ سے
جو خوانین یا دوسرے لوگ سکھوں (اور انگریزوں) سے بھاگ کر ستھانہ
پہنچے وہ ان کو پناہ دیتا تھا۔ وہ علاقے کی پٹھان اقوام اتمازئی۔ مداخیل
اتمان زئی اور گدون کا پیر تھا۔ یہ لوگ اس کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ اس
وجہ سے وہ نواب آف امب (پائندہ خان تنولی) کا حریف بھی تھا۔ وہ نواب
کے مقابلے میں ہندوستانی مجاہدین کی پیٹھ ٹھونکتا اور نواب امب کے علاقہ
کو نقصان پہنچاتا۔"

"سید اکبر شاہ فرنگی حکومت کا مخالف اور دشمن تھا، ہندوستانی مجاہدین کی
کافی جمعیت ہر وقت اس کے ساتھ رہتی اور وہ سرکاری علاقے میں دراندازی کرتے"
یہ سید اکبر شاہ ہی تھے جنہوں نے اپنے مجاہدوں اور یوسف زئی غازیوں کی ایک جمعیت
کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوری فوج کا مقابلہ کیا اور اسے لوہے کے چنے چبوائے
اگر اس موقع پر کابل سردار یار محمد خان اور محمد عظیم خان تھوڑی سی بھی ہمت کرتے تو سکھ
کبھی صوبہ سرحد کی سرزمین پر قدم نہ رکھ سکتے۔ لیکن عین موقع پر یار محمد خان نے فرار ہو کر
ہشت نگر میں پناہ لے لی اور سردار محمد عظیم خان اپنے سارے لاؤ لشکر کے ساتھ چپکے

ہی میں مقیم رہا اور آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

پیر سباک کے اس معرکہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب پشاور کے کابلی گورنر یار محمد خان نے اندر ہی اندر سکھ راجہ رنجیت سنگھ سے صلح کر لی اور اس کا باجگذار بننا قبول کر لیا تو کابل کے سردار محمد عظیم خان کو بڑا طیش آیا اور وہ سکھوں سے "دو دو ہاتھ" کرنے کی غرض سے اپنے لاؤ لشکر کو لے کر پشاور آیا۔ اس کی آمد کا سنتے ہی یار محمد خان ہشت نگر بھاگ گیا تاکہ عظیم خان کے غضب کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ عظیم خان خود تو چمکنی میں ٹھہرا رہا لیکن اپنے بھتیجے محمد زمان خان اور خٹک سردار فیروز خان کے بیٹے صدیق خان کو فوج دے کر نوشہرہ بھیجا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس وقت اٹک میں مقیم تھا۔ ۱۲ مارچ ۱۸۲۴ء کو اس نے دریائے سندھ کو پار کیا اور ۱۴ مارچ کو اکوڑہ خٹک کے قریب خیمہ زن ہو گیا اس اثناء میں سید اکبر شاہ ترمذی نے سارے علاقہ یوسف زئی کا دورہ کر کے غازیوں کو پیر سباک کی پہاڑیوں پر جمع کر رکھا تھا۔ سکھ فوج کی تعداد چوبیس ہزار تھی اُسے رسالے اور توپ خانے کی مدد بھی حاصل تھی، اس کے مقابلے میں مسلمان غازی ایک ہزار سے زیادہ نہ تھے۔ سکھ حکمران نے سب سے پہلے اپنے مشہور سرفروش اکالی پھولا سنگھ کو طوفانی دستے کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف بھیجا لیکن سید اکبر شاہ کی کمان میں غازی اس جوش سے لڑے کہ اکالی پھولا سنگھ اور اس کے تین ساتھی افسر غربا سنگھ، کرم سنگھ اور جھول کو دیکھتے ہی دیکھتے ہلاک کر دیا۔ سکھ فوج کے فرنگی افسر بھی معرکے میں کام آئے۔ صبح سے شام تک مسلمان مجاہد گاجر مولی کی طرح دشمن کے سپاہیوں کو کاٹتے رہے۔ سر چارلس وڈ کے بیان کے مطابق سکھوں کے دو ہزار سپاہی اس معرکے میں مارے گئے، اس سے زیادہ نقصان سکھ فوج کو کبھی اٹھانا نہ پڑا تھا ——— یہ حال دیکھ کر خود مہاراجہ رنجیت سنگھ ہاتھی پر آگے بڑھا گورکھا پلٹنیں اس کے ساتھ تھیں ——— سید اکبر شاہ اور غازی اس شان سے لڑے کہ دنیا دنگ رہ گئی ——— اندھیرا ہوا تو ہر مجاہد یا تو لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کر چکا تھا اور یا زخمی ہو کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فتح کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی اکالی پھولا سنگھ جیسے جان نثاروں کی موت کا صدمہ تھا، اس نے کئی دن تک مرنے والوں کا سوگ منایا۔ اکالی پھولا سنگھ کی سمادھ وہیں بنوائی اور اس کے ساتھ پیر سباک کی ہزاروں ایکڑ اراضی وقف کر دی۔

سید اکبر شاہ اور مسلمان غازیوں کے ہٹتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے فتح پشاور کا دروازہ کھل گیا ——— وہ مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور ۱۷ مارچ ۱۸۲۴ء کو فتح کے شادیانے بجاتا ہوا پشاور میں داخل ہو گیا۔

جہاں سید اکبر شاہ اور مسلمان غازیوں نے دین کے نام پر اپنا خون نثار کیا اور جانوں کا نذرانہ پیش کیا وہیں ہوس اقتدار کے مارے کابل سرداروں کی غیرت میں کوئی جوش نہ آیا اور انہوں نے سکھ مہاراجہ کا باج گذار بننا قبول کر لیا۔

سید عبدالجبار شاہ ترمذی

سید عبدالجبار شاہ بھی سادات ستھانہ کے خاندان کے ایک نامور فرد تھے علم و فضل میں صاحب کمال ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے سیاست دان اور صاحب شمشیر و علم بھی تھے، ۱۸۹۷ء میں انگریزوں نے مالاکنڈ اور سوات پر لشکر کشی کی تو لنڈاکی کے مقام پر ان کے خلاف کھل کر داد شجاعت دیتے رہے، ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے، بے حد وجیہہ اور بارعب انسان تھے، سیادت و امارت انہیں ورثے میں ملی تھی، بڑے خوش گفتار اور وسیع المطالعہ انسان تھے، تحقیق و جستجو کا ذوق تھا، انہوں نے اپنے جد امجد حضرت پیر بابا علیہ الرحمتہ کے حالات اور صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے تاریخی واقعات پر مبنی ضخیم کتاب "عبرۃ لاولی الابصار" تحریر کی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کا قلمی نسخہ دیکھ کر بہت پسند فرمایا ——— انہوں نے لکھا کہ میرے محدود علم کے مطابق تاریخ سرحد اور تاریخ آزاد قبائل کے اتنے مفصل اور جامع حالات شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکیں"

اگست ۱۸۹۸ء میں نواب محمد اکرم خان آف امب نے سید عبدالجبار شاہ کو اپنے ہاں بلا لیا جہاں وہ ۱۹۰۷ء تک وزیر مختار بھی رہے اور ریاست کے ولی عہد خانیزمان کے اتالیق کے طور پر

بھی فرائض انجام دیتے رہے۔

جنوری ۱۹۱۴ء سے ستمبر ۱۹۱۵ء تک سیّد عبدالجبار شاہ سوات، بونیر اور نواحی علاقوں کے بادشاہ بھی رہے۔ وہاں سے دوبارہ امب چلے آئے اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۶ء تک وہاں وزارت کے عہدہ پر فائز رہے۔

صوبہ سرحد اور افغانستان کے لوگ پیر بابا سیّد علی غواص ترمذی علیہ الرّحمۃ کے گھرانے کی اتنی عزت و تکریم کرتے تھے جس کا اندازہ بھی آج کل کے اس مادہ پرستی کے دور میں نہیں کیا جاسکتا، امیرانِ کابل اس بات کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے کہ اپنی بیٹیاں کو نرڑکے اس نامور سیّد گھرانے میں بیاہ دیں۔ دوسرے سرکردہ رئیس اور سردار بھی اس گھرانے کی رشتہ داری کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ سیّد عبدالجبّار شاہ نے کئی شادیاں نہایت اونچے گھرانوں میں کیں۔

اتفاق سے بُخارا کے ولی عہد شہزادہ سیّد عبدالملک کو حالات سے مجبور ہو کر ملک چھوڑنا پڑا تو وہ پہلے امیر کابل شیر علی خان کے پاس ٹھہرے۔ امیر نے اپنی بھتیجی سے ان کی شادی کرادی۔ یہ شہزادی اس سے قبل امیر شیر علی خان کے فرزند ولی عہد عبداللہ جان سے منسوب تھی جو عالمِ شباب میں فوت ہوگئے تھے۔ بعد میں شہزادہ بخارا ایبٹ آباد آگئے، حکومت نے اُن کی قدر افزائی کے طور وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ وہ انتہائی دیندار، وسیع المطالعہ اور عالم فاضل انسان تھے، بڑی پُر وقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد وہ سیّد عبدالجبار شاہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی صاحبزادی (جو ان کی خاندانی بیگم کے بطن سے تھی) ان کے نکاح میں دے دی۔ بخارا کے یہ ولی عہد شہزادہ نومبر ۱۹۰۹ء تک زندہ رہے، وہ سیّد عبدالجبار شاہ کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے اور اُن کے علم و فضل اور خاندانی وجاہت کے انتہائی قدردان تھے۔

سیّد جمال الدّین افغانیؒ

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے خانوادے کے لئے یہ فخر ہی کچھ کم نہیں کہ عالمِ اسلام کے عظیم بطل جلیل، شہرۂ آفاق مسلمان مفکّر، علمبردار اتحاد بین المسلمین، عظیم قائد اور داعیٔ انقلاب سیّد جمال الدّین افغانیؒ اسی ترمذی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مؤرخوں نے اُن کی جائے ولادت سعد آباد لکھی ہے، تاہم اصل میں یہ کونڑ کا مقام سید آباد ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ ۱۲۵۴ ہجری (۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے ہی گھرانے کے بزرگوں سے حاصل کی، بعد میں مروّجہ علوم کی تکمیل کے لئے کابل گئے۔ انہیں فلسفہ اور علوم طبیعی سے خاص مناسبت تھی۔ کچھ عرصہ انہوں نے ہندوستان میں رہ کر جدید تعلیم حاصل کی یہیں سے وہ حج بیت اللہ کے لئے مکّہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز دن تھے۔ وہ اہل ہند کے جذبۂ حریّت سے خاصے متاثر ہوئے۔

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ افغانستان پہنچے تو امیر دوست محمد خان نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنا وزیر مقرر کیا۔ تاہم افغانستان کی آئے دن کی خانہ جنگیوں سے تنگ آکر انہوں نے ملک چھوڑ دینے ہی میں مصلحت سمجھی۔ وہ ہندوستان چلے آئے اور یہاں کے مشاہیر سے ملاقاتیں کیں، اس دوران انگریزی حکومت اُن کی کڑی نگرانی کرتی رہی، اس پر وہ دوبارہ حج کے ارادے سے مکّہ معظّمہ چلے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ قاہرہ پہنچے جہاں جامعہ ازہر کے علماء آپ سے بڑے متاثر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں وہ ترکی چلے گئے جہاں انہیں محکمہ تعلیم کی جانب سے مسجد ایاصوفیہ اور مسجد احمد میں خطبہ دینے کی دعوت دی گئی۔ اُن کی غیر معمولی شہرت اور ہر دلعزیزی کے پیش نظر ترکی کے علماء کا ایک طبقہ ان سے حسد کرنے لگا۔

سیّد جمال الدین افغانی کے پیش نظر دُو مقاصد جلیلہ تھے۔ اوّلاً مسلمان عوام کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانا اور دوم اتحادِ عالم اسلامی کا حصول۔ مارچ ۱۸۷۱ء میں وہ مصر پہنچے

اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کام کرنے لگے۔ مصری نوجوان جوق در جوق ان کے حلقہ اثر میں آتے گئے۔ اپنے انقلابی خیالات کی اشاعت کے لئے انہوں نے ایک روزنامہ قاہرہ سے جاری کیا۔ ان دنوں برطانیہ کو مصر میں بڑا اثر و نفوذ حاصل تھا۔ برطانوی شہنشاہیت سید جمال الدین افغانی کے جذبۂ جہاد سے بڑی خائف تھی۔ چنانچہ ان کے ایما پر حکومت مصر نے ستمبر ۱۸۷۹ء کو انہیں ملک بدر کرا دیا۔ اس پر سید جمال الدین افغانی ایک بار پھر ہندوستان چلے آئے۔ اپنے قیام حیدرآباد کے دوران انہوں نے دہریوں کے بطلان میں ایک فارسی رسالہ لکھا جس کا ترجمہ عربی میں مصر کے مفتی محمد عبدہٗ نے بھی کیا۔ اس رسالے میں انہوں نے ڈارون کے نام نہاد فلسفے کی دھجیاں اڑا دیں اور ثابت کیا کہ فقط مذہب اور بالخصوص اسلام ہی انسانی معاشرے کے استحکام اور سلامتی اور قوموں کی ترقی کی ضمانت دے سکتا ہے جب کہ لادینی مادیت انحطاط اور زوال کا سبب ہے، انہوں نے بتایا کہ قرآن کی رو سے انسان اشرف المخلوقات ہے اور بہترین امت، امتِ مسلمہ ہے۔

سید جمال الدین افغانی کو رات دن فقط یہی دھن تھی کہ مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کو قرونِ اولیٰ کے اسلامی انقلاب سے روشناس کریں، اس غرض سے وہ یورپ کے مادی نظریات کے خلاف مصروف جہاد رہے، کبھی برطانیہ جاتے کبھی امریکہ۔ وہ جگہ جگہ لیکچر دیتے انہوں نے ثابت کیا کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام اور صرف اسلام ہی کی تعلیمات میں تمام انسانی مسائل کا حل موجود ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام اور سائنس میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ماضی میں مسلمان قوم میں بڑے بڑے نامور سائنس دان گذرے ہیں۔

اہلِ یورپ کے ملحدانہ نظریات کا رد کرنے کے لئے انہوں نے اپنے نامور شاگرد محمد عبدہٗ کے ساتھ مل کر پیرس سے "عروۃ الوثقیٰ" کے نام سے اخبار جاری کیا۔ اس جریدہ میں دوسرے امور کے علاوہ اسلامی ملکوں میں فرنگی کی کارستانیوں اور حکمت عملی کو بھی بے نقاب کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگایا۔ انہیں اپنے شاندار

اور عظیم ماضی سے روشناس کرایا۔ انہوں نے فروعات کی بجائے اسلام کے ان زرّیں اصولوں کی تبلیغ کی جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی قوّت اور شوکت حاصل کر سکتے ہیں انہوں نے جہاں دشمنانِ اسلام کی خبر لی۔ وہیں اُن مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں پر بھی شدید نکتہ چینی کی جو یورپی حکومتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ ان کی کوششوں کی بدولت ایران، مصر اور ترکیہ میں سچی اسلامی بیداری پیدا ہوئی۔ لوگ مطلق العنانیت کو ناپسند کرنے لگے اور جمہور کی سربلندی اور فلاح و بہبود کو اپنی منزلِ مقصود سمجھنے لگے۔

سیّد جمال الدین افغانی وہ مردِ قلندر تھے جو مصلحتوں کی بجائے صرف حقائق پر نظر رکھتے تھے حکومتیں انہیں ہر قیمت پر خریدنا چاہتی تھیں لیکن وہ تو حضرت پیر بابا کے مشن پر چلتے ہوئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کام کیا کرتے تھے۔ اس راہ میں انہیں مشکلات کے پہاڑوں سے ٹکرانا پڑا اور مخالفت کے طوفانوں سے گذرنا پڑا لیکن اللہ کا یہ نیک بندہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہا۔

اتحادِ عالمِ اسلامی کے اس سب سے بڑے علمبردار کے آخری ایّام بڑے کٹھن گذرے، ترکی کے خود پرست حکمران کے رویّہ کی وجہ سے وہ قیدی کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا، کبھی انہیں سازشوں میں ملوث قرار دیا گیا۔ ۱۱ر مارچ ۱۸۹۶ء کو جب شاہِ ایران کو افغانیؒ کے ایک وفادار پیروکار نے قتل کر دیا تو ان پر پابندیاں اور بھی سخت کر دی گئیں۔ بالآخر طویل بیماری اور کسمپرسی کے عالم میں سیّد جمال الدین افغانی ۹ر مارچ ۱۸۹۷ء کو وفات پا گئے۔ انہیں ترکی ہی میں دفن کیا گیا تاہم ۱۹۴۴ء میں اُن کے ہم وطنوں کے اصرار پر ان کی نعش پشاور اور پھر وہاں سے کابل لے جائی گئی جہاں ۲ر جنوری ۱۹۴۵ء کو دوبارہ انہیں کابل کے مضافات میں علی آباد کے قریب دفن کیا گیا اور ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سیّد جمال الدین افغانیؒ مشرقِ جدید کی تاریخ میں آزادیٔ ایشیا کے پہلے مجاہد تھے حکیم الامت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے انہیں زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا مؤسس قرار دیا ہے

پچھلی صدی عیسوی کے سبھی مسلمان زعماء سید جمال الدین افغانی کی ذات اور افکار سے انتہائی متاثر تھے، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، علامہ عنایت اللہ خان المشرقی اور مولانا ابوالکلام آزاد سبھی نے ان کی عظمتِ فکر کا دلی اعتراف کیا ہے، حقیقت یہی ہے کہ سید جمال الدین افغانیؒ کے پائے کا کوئی مسلمان رہنما سارے پختونخواہ میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اقبال انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سیّد السادات مولانا جمال

زندہ از گفتارِ اُو سنگ و سفال

سیّد جمال الدین افغانیؒ اپنے جدِ امجد حضرت پیر بابا بونیریؒ کی مانند عمر بھر اپنے عہد کی دھریت اور اس کے اثرات کو مٹانے کے لئے کوشاں رہے۔ انہوں نے مغرب کے لادینی خیالات و افکار کے خلاف نہ صرف قلمی جہاد کیا بلکہ اپنی پوری زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ پہلے مسلمان فلاسفر تھے جنہوں نے ڈاروِنیت اور مارکسیت کا حل سائنٹفک انداز میں کیا اور دینِ اسلام کی حقانیت کو واضح کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ "تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کر سکتا ہے۔"

اتحادِ عالم اسلامی کا حصول ان کا نصب العین تھا۔ وہ مسلمانوں کو خلافتِ اسلامیہ کے جھنڈے تلے متحد اور منظم کرنا چاہتے تھے، چنانچہ "العروۃ الوثقیٰ" میں وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "مسلمان کبھی ایک پرجلال سلطنت کے ماتحت متحد تھے۔ چنانچہ فلسفہ اور علم و فضل میں ان کے کارنامے آج تک تمام مسلمانانِ عالم کے لئے باعثِ فخر ہیں۔" تاہم مغربی اقوام نہ صرف ان کی سیاسی آزادی کو سلب کرتی ہیں۔ بلکہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کو کمتر خیال کر کے مغربی افکار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔۔۔ انہوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی قدروں کی قدر کریں اور اپنی ثقافت اور تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔

یہ جمال الدین افغانیؒ ہی تھے جنہوں نے اہلِ مشرق کو بتایا کہ "جن لوگوں کو اپنی زبان نہ ہو

ان میں تربیت کا صحیح تصوّر پیدا نہیں ہو سکتا اور جس قوم کا اپنا ادبی سرمایہ نہ ہو اس کی زبان بھی نہیں ہوتی ۔ نیز جس قوم کی اپنی تاریخ نہیں، اس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں ہو سکتی اور جو لوگ اپنے قومی ورثہ کو حاصل نہیں کر سکتے یا اپنے بزرگوں کے کارناموں کی قدر نہیں کر سکتے اُن کی کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی ۔"

سیّد جمال الدین افغانی ترمذیؒ کی زندگی ایک معلّم، مبلّغ اور مصلح کی زندگی تھی ۔ ان کا نصب العین مسلمانوں کو اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ غلبۂ اسلام کا عظیم مقصد ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی آنکھ سے اوجھل ہوتے نہیں پاتا تھا، اس مقصد سے انہیں اتنا انہماک تھا کہ انہوں نے ساری زندگی مجرّدانہ اور قلندرانہ گذار دی ۔ وہ بلاشبہ حضرت پیر بابا سیّد علی غواص ترمذی علیہ الرّحمۃ کی لڑی کے ایک نہایت ہی نایاب اور انمول موتی تھے ۔ اُمّتِ مسلمہ ان کے احسانات کو ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتی ۔

یہ سیّد جمال الدّین افغانیؒ ہی کی تعلیمات، رُشد و ہدایت اور کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان عوام میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی ۔ ان کے دل میں شمعِ آزادی روشن ہوئی ۔ وہ فرنگی استعمار اور استبداد کو ختم کرنے پر اُٹھ کھڑے ہوئے، ہر جگہ آزادی کی تحریکوں نے سر اٹھایا اور ایک ایک کر کے انہوں نے غلامی کا جُوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ آج بفضلِ خدا پچاس کے قریب آزاد مسلمان ممالک دنیا کے نقشے پر موجود ہیں ۔ کبھی وہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور کبھی مؤتمرِ عالمِ اسلامی کے پلیٹ فارم پر جمع ہوتے ہیں، دیکھا جائے تو اس بیداریٔ اُمّت کا اصل سہرا سیّد جمال الدّین افغانی علیہ الرّحمۃ ہی کے سر ہے ۔

حضرت پیر باباؒ کے جانشین

حضرت سید علی غواص ترمذی عرف پیر بابا علیہ الرّحمۃ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے بڑا شرف بخشا (تفصیل دوسری جگہ مذکور ہے) ان کی اولاد میں پشت در پشت کامل اور صالح انسان پیدا ہوئے جن کی تبلیغی اور تعلیمی کاوشوں سے سارے صوبہ سرحد اور افغانستان کے مسلمان مستفیض ہوئے

اور ہر طرف اسلام کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔

ان کے روحانی سلسلے کی حالیہ مشہور شخصیت حضرت سید پائندہ شاہ المعروف چڑائی بابا گزرے ہیں، وہ علاقہ غوربند ضلع سوات میں ۱۲۶۳ ہجری کو تولد ہوئے یہ وہ علاقہ ہے جو برفانی تودوں اور گلیشیروں سے اٹا پڑا ہے۔ راستے بڑے کٹھن ہیں۔ اس دورافتادہ خطہ میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں ان کا بڑا حصہ ہے ۔۔ انہوں نے چڑائی میں مسجد، دینی مدرسے اور لنگر کا سلسلہ قائم کیا، وہ مسافروں، ناداروں اور مسکینوں کی فراخدلانہ مدد کرتے ۔۔ علاقے کے لوگوں کے تنازعات ختم کراتے اور فضول رسم ورواج کا خاتمہ کرنے میں کوشاں رہتے ۔ یہ اعزاز بھی انہی کے حصے میں آیا کہ انہوں نے والی سوات میاں گل شہزادہ عبدالودودؒ کی اجازت سے مزار پیر باباؒ سے پیوست ایک رفیع الشان جامع مسجد تعمیر کرائی ۔ یہ خانہ خدا فن تعمیر کا ایک خوبصورت نقش ہے جس سے بہتر مسجد سارے علاقہ میں موجود نہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت چڑائی باباؒ کو خواب میں حضرت خواجہ پیر بابا علیہ الرحمۃ کی طرف سے اس مسجد کی تعمیر کی ہدایت ہوئی تھی چنانچہ انہوں نے وہ خواب پورا کر دکھایا۔ حضرت چڑائی بابا نے ۱۱ رجب ۱۳۶۸ھ کو وفات پائی ۔ ان کا مقبرہ اپنے جدامجد حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ کے مرقد پُر انوار مسجد پیر باباؒ کے ملحق ہے۔ ارادت مند وہاں عقیدت واحترام سے حاضری دیتے ہیں

سال ۱۹۸۶ء تک حضرت چڑائی باباؒ کے فرزند ارجمند سید معین الدین شاہ صاحب ترمذی سجادہ نشین تھے جنہوں نے مزار پیر باباؒ کے پاس ہی ایک دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی جہاں سارے سوات، غوربند، کوہستان اور دوسرے علاقوں کے طالب علموں کو نہ صرف قرآن وحدیث اور مروجہ علوم اسلامی کی تعلیم مفت دی جاتی ہے بلکہ انہیں خورد ونوش اور قیام وطعام کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ درس گاہ یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو قائم ہوئی اور آج تک یہاں مشہور علمائے دین طلباء کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں رات دن مصروف ہیں۔

جہادِ آزادی اور صوفیائے کرام

بعض حلقے اپنی مخصوص اغراض کے پیشِ نظر یا نا واقفیت کی بناء پر طریقِ خانقاہی اور نظامِ طریقت پر معترض ہوتے ہیں، وہ تصوّف کو گوشہ نشینی، رہبانیت اور جہادِ زندگی سے فرار کے "فرضی" معانی پہناتے ہیں ۔۔ وہ نہیں جانتے کہ تصوّف تو بیداری اور جدوجہد کا درس لئے ہوتے ہے۔ صوفیائے کرام تو ایک دقیقہ بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ اپنے جسم اور روح کو ہمہ وقت اور ہمہ تن اپنے مولائے حقیقی کی عبادت اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کئے رہتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، صرف صوبہ سرحد ہی کی تاریخ کا مطالعہ اس سلسلے میں حقیقتِ حال کا شاہد ہے۔ یہ اللہ والے ہی تھے جنہوں نے اکبری الحاد کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کیا ۔۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنہوں نے سکھوں اور فرنگیوں کے خلاف لوگوں کو منظم اور صف آراء کیا اور یہ سجّادہ نشین اور پیرانِ طریقت ہی تھے جنہوں نے کسی بڑی سے بڑی کافر طاقت کے قدم صوبہ سرحد کی سرزمین پر جمنے نہ دیئے جب کبھی دینِ اسلام پر کڑا وقت آیا۔ یہ حضرات کرام اپنے حجروں سے نکلے اور میدانِ جہاد میں غازیوں کے لشکروں کی کمان کرنے لگے۔ حضرت اخون صاحبِ سوات، حضرت نجم الدین ہڈہ ملّا۔ فقیر صاحب النگر، حاجی صاحبِ ترنگ زئی، شہزادہ فضل دین، سرتور فقیر اور بیسیوں ایسے حضرات کے نام شمار کئے جا سکتے تھے۔ جنہوں نے فرنگی کی توپ و تفنگ اور لاؤ لشکر کا مقابلہ خالی ہاتھوں محض خدائی طاقت اور قوّت ایمان سے کیا۔ ان حضرات نے جابر حکمرانوں کے منہ پر کلمۂ حق کہنے کی سنّت ادا کی ۔۔ انہوں نے انتہائی بے غرضی اور اخلاص سے لوگوں میں اللہ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی خاطر سر کٹانے اور جان دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ ان حضرات ہی کی بدولت لوگوں نے اسلامی سادگی کا طریق اپنایا اور تقویٰ و طہارت کے پانی سے دلوں کو پاک کیا۔ ظاہری تعلیم صرف انسان کے ظاہر کو سنوارتی ہے جب کہ طریقت کی تعلیم و تربیّت سے نفوس کا تزکیہ ہوتا رہا۔ دل پاک ہوتے اور دل بدلے

تو دنیا بدل گئی ۔ افکار و اعمال میں انقلاب آگیا ۔ للّٰہیت مقصد و مقصود بن گئی ۔ ان حضرات کے نفس گرم نے دلوں کو حرارت اور سینوں کو نور بخشا ، ان نفوس قدسیہ نے انسان کو صرف اور صرف اللہ کی چوکھٹ پر جھکنا سکھایا اور غیر اللہ کا ڈر دل سے نکال دیا ۔ صوبہ سرحد کے ان پاک باطن صوفیائے کرام کی مجاہدانہ زندگی کا مطالعہ ذہنوں کو جلا اور دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرور بخشتا رہے گا ۔

حضرت پیر باباؒ کا عظیم کارنامہ

حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف بہ پیر بابا علیہ الرحمۃ کا سب سے بڑا دینی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سرزمین یوسف زئی بالخصوص کوہستانی علاقوں میں اصلاح عقائد کی مہم کامیابی سے چلائی ، عوام کو اسلام کے بنیادی ارکان سے آشنا کیا اور نام نہاد اور خود ساختہ پیروں اور پیشواؤں کی بیخ کنی کی ۔ اس سلسلے میں ایک تو پیر باباؒ کو اپنے مرشد کی جانب سے ہدایت ہوئی تھی کہ وہ ان دورافتاد علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا فریضہ انجام دیں ، دوسرے اپنی باطنی بصیرت اور نورِ معرفت کی بناء پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں پختون قوم نے اور پختون قوم کی تاریخ میں یوسف زئی قبائل کا کردار بڑا قابلِ فخر رہا ہے ، اس لئے اگر یوسف زئی مائل بہ اصلاح ہوگئے تو ان کے اثر و نفوذ اور عظیم صلاحیتوں کی بناء پر اسلام کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا اور سارے علاقوں میں دینِ حق کا بول بالا ہو جائے گا ۔

یوسف زئی کی ان عظیم صلاحیتوں کا اعتراف خود حضرت پیر باباؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں [1]

"میں نے جب مختلف اقوام اور قبائل کو دیکھا تو یوسف زئی قبیلوں کو ایسی حالت میں پایا کہ وہ سب نہایت ہی سادہ دل (مخلص) اور دین کے گرویدہ

---

[1] خود نوشت ۔ سید عبد الجبار شاہ

تھے۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ ان کے جوان بوڑھوں سے بھی زیادہ دینداری میں استوار اور ان کی عورتیں مردوں سے بھی بڑھ کر دینی امور پہ کاربند اور عمل پیرا تھیں۔ یہاں تک کہ اُن کا بچّہ بچہ دین کی طرف مائل تھا"

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر یوسف زئی کی اسلامی خدمات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ

" کچھ تو غوثِ بونیر (حضرت پیر باباؒ) کی تعلیم و تربیّت کا اثر معمولی اثر نہ تھا اور کچھ دین کی راہ میں جہاد کرنا اور ہر طرح کی قربانی دینا یوسف زئی قوم کے خمیر و فطرت میں داخل تھا۔ میدانی علاقوں کے لوگوں کی اصلاحِ احوال کے بعد حضرت پیر باباؒ کے خلفاء اور ارادت مندوں نے یوسف زئی مجاہدوں کے تعاون سے کوہستانی علاقوں کے لاکھوں لوگوں کو مشرّف بہ اسلام کیا۔"

اس ضمن میں حضرت پیر باباؒ کا کہنا ہے کہ

" تقویتِ اسلام کی خاطر ان قبیلوں میں سے کوئی بھی قبیلہ جہاد بالسیف میں یوسفزئی سے بڑھ کر جان نثار نہیں نکلا۔ اُن کی بے نظیر جرأت اور جانبازی کی بدولت کوہستان کے کفّار کا خاتمہ ممکن ہوا۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے بزرگ صوفیاء اور علماء بھی کام آئے (یہاں تک کہ خود حضرت اخون درویزہ کا بیٹا بھی اس جہادِ سوات میں شہید ہوا)

یوسف زئی قبائل کی اِسلام دوستی کے اس واضح اعتراف کے ساتھ پیر باباؒ کی نظر ان خرابیوں پہ بھی تھی جو اُن دنوں صدری معاشرے میں سرایت کر چکی تھیں۔ پیر باباؒ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ خرابیاں اس لئے معاشرے میں در آئی ہیں کہ لوگ تعلیم سے بے بہرہ ہیں وہ دین کے احکام پہ عمل کرنے کی بجائے جادو ٹونے اور مافوق الفطرت مظاہروں ہی کو اپنی نجات کا ضامن سمجھنے لگ گئے ہیں۔ انہوں نے اس دور کے مسلمان معاشرے کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ :۔

"..... لیکن سب کے سب اس مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے کہ ایک تو دینی تعلیم وتربیت کا نظام مفقود ومعدوم تھا۔ جہالت کا دَور دَورہ تھا، نہ کوئی واعظ تھا نہ عالم دین۔ علماء۔ اتقیاء ناپید تھے اس پرمصیبت یہ کہ قریہ قریہ، قبیلہ قبیلہ کا "پیر" ہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ لیکن ان میں سے اکثر "پیر" جاہل، ملحد اور بدعقیدہ تھے۔ انہوں نے اپنی اغراض ومقاصد کی خاطر لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا اور لوگ اسلام کی حقیقی تعلیم سے بہت دور جا پڑے تھے"۔

حضرت پیر بابا کو سرحدی عوام کی نفسیات کا بخوبی علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پختون فطرتاً مقلد واقع ہوئے ہیں۔ وہ دلیل کو ماننے اور کتابی تعلیمات کو سمجھنے کی بجائے زندہ شخصیت کے پیچھے چلنے والے ہیں، اس لئے جب بھی کسی "پیر" یا "بزرگ" کے آنے کا سنتے ہیں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے عقائد اور اعمال کی تحقیق کئے بغیر اس کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔ اور یوں دین کے بنیادی ارکان پر چلنے کی بجائے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت پیر بابا کا جہاد "اہل" صوفیائے خام" اور جعلی پیروں کے خلاف تھا۔ وہ یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، صرف وہی پیر اور مرشد قابلِ احترام ہے جو شریعت محمدی پر پوری طرح کاربند ہو۔ حضرت پیر بابا اور علمائے حقانی کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباعِ کتاب وسنت میں انتہائی سعی کی جائے۔ اسوۂ رسول ﷺ و صحابہؓ کو دلیل راہ بنایا جائے۔ دین کے اوامر ونواہی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات وعبادات کو مقصودِ حیات سمجھا جائے اور قلب کو ماسوا کی محبت اور تعلق سے پاک صاف رکھا جائے۔

حضرت پیر بابا کا مشن یہی تھا کہ اسلامی معاشرے کو اندرونی اور بیرونی فتنوں سے محفوظ بنایا جائے اور لوگوں کا تزکیہ باطن کر کے ایک پاکیزہ ماحول اور معاشرے کی تعمیر کی جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے تہیہ کر لیا کہ راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کریں گے اور ہر ممکن ایثار اور قربانی

سے کام لیں گے ۔ اپنے اس نصب العین کے حصول کے لئے حضرت پیر باباؒ اور ان کے ارادت مندوں نے ہر غلط کار کو للکارا۔ وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گئے ۔ انہوں نے ان نام نہاد "بزرگوں" سے مناظرے کئے ۔ وعظ و ارشاد کی مجلسیں برپا کیں ۔ سید عبدالجبار شاہ مرحوم نے تیس کے قریب ایسے "بدعقیدہ" پیروں کی تفصیل دی ہے جو پیر باباؒ کے دور میں پختون معاشرے میں توہمات اور غیر اسلامی نظریات کے پرچار میں مصروف تھے ۔ ان میں سے اکثر ان پڑھ اور جاہل تھے ۔ وہ پیر باباؒ، اخون درویزہؒ اور ان کے عالم فاضل ساتھیوں کے دلائل کی تاب نہ لاسکے اور یا تو ان علاقوں سے کوچ کر گئے اور یا اپنے باطل عقائد سے تائب ہو گئے۔

ان مناظروں اور مقابلوں میں سب سے قابلِ ذکر وہ معرکے تھے جو حضرت پیر بابا بالخصوص آن کے ماذون اخون درویزہ باباؒ اور پیر بایزید انصاری اور اس کے پیروکاروں کے مابین دیکھنے میں آئے آج کل کے چند اہلِ قلم نے ان مذہبی مناظروں کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اسے "قومیت" کے جدید "تقاضوں" کی روشنی میں پرکھ کر مختلف محاکمے قائم کئے ہیں ۔ اس سلسلے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "قومیت" کی موجودہ اصطلاح کو اس دور میں کوئی وقعت حاصل نہ تھی ۔ پھر جہاں تک اسلامی قومیت کا تعلق ہے اس کی بنیاد "ایمان" پر ہے نہ کہ وطن و نسل پر ۔ ابوجہل اور ابولہب قریش ہوتے ہوئے بھی اسلامی قومیت کے دائرے سے خارج ہے اس لئے کہ وہ غیر اسلامی عقائد کے علمبردار تھے اور بلال حبشیؓ اور سلمان فارسیؓ غیر عرب ہوتے ہوئے بھی مسلمان قوم کے لئے واجب التعظیم ہیں کہ وہ اسلامی عقائد و اعمال میں ہم سے ہم آہنگ ہیں ۔ عقائد کا یہ اشتراک ہی اسلامی قومیت کی بنیاد ہے

ان حضرات کے نزدیک پیر باباؒ اپنی قرابت داری کی وجہ سے مغلوں کی طرف داری کرنے کے "مترکب" اور بایزید انصاری مغلوں کی مخالفت کے باعث مقامی "ہیرو" قرار دیئے جاتے ہیں ۔ حالانکہ ان دونوں کا اختلاف محض عقائد کا اختلاف تھا ۔ حضرت پیر باباؒ ایک مردِ خدا آگاہ تھے ان کی دوستی اللہ کے لئے تھی اور عناد بھی محض اللہ کی خاطر ۔ اگرچہ بایزید نے مذہبی تحریک کو سیاسی تحریک میں بدلنے کی بڑی کوشش کی لیکن پیر باباؒ اس کے باوجود صرف بایزید کے

مذہبی عقائد کو اختلاف کی بنیاد قرار دیتے ہے — تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے کہ مغل شہنشاہوں سے حضرت پیر بابا کو کوئی جاگیر ملی ہو یا انہوں نے مغل دربار سے کوئی مراعات حاصل کی ہوں — ان کی اپنی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ یوسف زئی اور دوسری پختون اقوام کی صلاحیتوں کا کس قدر واشگاف الفاظ میں اعتراف کرتے ہے اور ان کی ساری عمر پختونوں کی خدمت میں گذری — انہوں نے ساری عمر فقر و فاقہ میں گذاری کوئی دنیوی منفعت یا غرض ان کے پیش نظر نہ رہی — پھر یہ مفروضہ "کیسے مان لیا جائے کہ وہ پختونوں کے بہی خواہ اور ہمدرد نہ تھے — اور اگر وہ پختونوں کے خیر خواہ نہ تھے تو پھر ان کا خیر خواہ اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ بجا کہ پیر بابا کے ارادت مندوں اور بایزید انصاری کے ساتھیوں میں اختلاف رائے موجود رہا — وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے، عین ممکن ہے کہ ان مناظروں اور مجادلوں میں بات تلخ بیانی اور الزام تراشی تک بھی پہنچی ہو اور اس سلسلے میں فکری اور عملی مخالفتوں نے سر اٹھایا ہو، ہم فریقین میں سے کسی کی بھی طرف داری کے حامی نہیں تاہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہر بات کو زمان و مکان کے تقاضوں پر ہی پرکھا جانا چاہیئے — آج سے چار سو سال پیشتر کا ماحول کچھ اور تھا — پھر عارفانِ الٰہی کا تو معاملہ ہی اور ہے — ان کے واردات قلبی اور مشاہداتِ باطنی کو عام عقلی اور مروجہ سیاسی معیاروں پر پرکھنا ہرگز مناسب نہیں — صوفیائے کرام پر یہ اعتراضات اصل میں محض ظاہر بینی اور سطحی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی کتاب "ہمعات" میں اس ظاہر بینی اور ناقدانہ رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اربابِ تصوف سے بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے — اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے

ارباب تصوف کے اقوال و احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے
ناپتے پھریں"۔

اس طرح حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ اور بایزید انصاری کے ارادت مندوں کے معرکوں اور مجادلوں کو فریقین کے مذہبی عقائد اور اسلامی نظریات ہی کی روشنی میں پرکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے نہ کہ انہیں سیاسی حریف مان کر "قومیت" کے موجودہ مغربی معیار پر جانچنا۔ صوفیائے کرام ان دُنیوی جھنجھٹوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مولوی اور صوفی میں فرق یہی ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو۔ اگر پیر بابا علیہ الرحمۃ سیاست یا حکومت سے دلچسپی رکھتے تو وہ یہ کام مغلیہ دربار اور مغلوں کی فوج میں رہ کر بھی کر سکتے تھے۔ لیکن انہیں تو لوگوں کی اصلاح کا فریضہ انجام دینا تھا۔ ان کے دلوں پر حکمرانی کرنی تھی نہ کہ صرف ان کے جسموں پر۔ دنیادار حاکموں، امراء اور سیاست دانوں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے راستے اور طریق کار جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق اس فرق کو یوں واضح کرتے ہیں :۔

"یہی وجہ ہے کہ علماء و امراء بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے وہ کام نہیں ہو سکتا جو فقیر اور درویش کو گذرتے ہیں۔ بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے۔ جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان و مال کا مالک ہے لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے اور اس لئے بادشاہوں کا اثر محدود ہوتا ہے اور درویشوں کا اثر بے پایاں۔ یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت و اقتدار حاصل ہوتا رہا کہ بڑے بڑے جبّار اور باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔"

پھر جہاں تک خود پیر بابا سیّد علی غواص ترمذی کی ذات کا تعلق ہے وہ پرہ جنبہ اور سیاسی رقابت سے بالاتر رہے۔ اگر بایزید انصاری کی شروع کی ہوئی تحریک کا مقابلہ اور ردّ کیا

تو اخون درویزہ نے کیا۔ ہوسکتا ہے جوشِ مجادلہ میں وہ تلخ بیانی یا زیادتی پر اتر آئے ہوں یا حریفوں نے ان کی تحریروں میں ایسی تحریف کر دی ہو جس سے ان کی ذات پر حرف آتا ہو۔ یہی بات بایزید انصاری پر بھی صادق آسکتی ہے، دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ فریقین کے سیاسی نظریوں اور ردّیوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی اُن کے مذہبی عقائد اور تحریروں میں کئی متنازعہ امور ضرور ہوں گے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں تک صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا تعلق ہے پیر بابا حضرت سید علی غواص ترمذیؒ کی خدمات جلیلہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا شمار اس علاقے کے سب سے بڑے محسنوں میں ہوتا ہے۔ ہزاروں لوگوں نے ان سے فیض پایا اور آج بھی ان کا روحانی فیض کا سلسلہ جاری و ساری ہے، اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کی تبلیغی کوششوں کا اعتراف ایک بزرگ دانش ور اور صاحب نظر ہستی نے یوں کیا ہے:

"مسلمان درویش پُرخطر اور دشوار گذار راستوں، سر بفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمانوں کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبیعت کے مخالف تھی یہاں کی آب و ہوا، موسم و رواج، صورت و شکل، آداب و اطوار، لباس ایات جیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہل ملک سے اور اہل ملک کو ان سے وحشت ہو۔ لیکن حال یہ ہے کہ ان کی وفات کے سینکڑوں سال بعد بھی ہزاروں لاکھوں بندگان خدا ان کے آستانوں پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور جن جن مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک "شریف" اور مقدس کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کو کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ امراء و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علماء و حکماء کے پاس [1]

---

[1] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

حضرت پیر باباؒ بھی ایک ایسے ہی مردِ حق شناس تھے۔ اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر وہ مسلمان عوام کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ علماءِ سوء اور جھوٹے پیروں کی مخالفت وہ محض اس لئے کرتے تھے کہ ان لوگوں نے دوراز کار باتوں میں لوگوں کو الجھا رکھا تھا ــــــ وہ "باطنی انوار" اور "مدارج" کے دعویدار تھے۔ فروعات میں پھنسے ہوتے تھے اور لوگوں کے سامنے اسلام کی سادہ اور مؤثر تعلیمات پیش کرنے کی بجائے اپنی "کرامتیں" دکھانے پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس کے برعکس پیر باباؒ کا اصل کام لوگوں کو اسلام کے بنیادی ارکان کا پابند بنانا تھا۔ وہ پختون قوم کی صلاحیتوں اور اس کی ذہنی استعداد سے بخوبی واقف تھے، اپنے مشن کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ

"یہ بات پختونوں کی سرشت میں داخل ہے کہ جب وہ کسی پیر فقیر کی آمد کا سنتے ہیں تو اسے ملنے ضرور جاتے ہیں اور یہ قوم زیرک اور عقل مند لوگوں سے خالی نہیں مگر اپنی بے علمی کی وجہ سے لوگ بعض گمراہوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں تاہم اگر ان کو حق و باطل کے مابین مباحثہ یا مناظرہ سننے کا موقع ملے تو وہ اپنی خداداد فراست کی وجہ سے حق و باطل میں تمیز بہت جلد کر سکتے ہیں ــــــ

ــــــ جب میں علاقہ سدوم پہنچا تو اطراف و جوانب سے جوق در جوق لوگ ملاقات کے لئے آنے لگے۔ میں نے اپنے مواعظ میں بار بار انہیں شریعتِ مطہرہ کی پابندی کی طرف مائل کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دی۔ لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات ذہن نشین کرائیں ــــ الحمدللہ! میری کوششیں رائیگاں نہ گئیں اور ہر جوان و پیر مرد اور عورت شریعتِ مصطفویؐ کی پیروی اور پابندی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات سمجھنے لگا۔"

یہ حضرت پیر باباؒ اور دوسرے اہل اللہ کی انہی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تعلیمات یہاں کے لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوتی گئیں۔ لوگ دینِ محمدیؐ کے شیدائی بن گئے، صوبہ سرحد

اور قبائلی علاقے اسلام کا ایسا مرکز بن گئے جہاں سے شریعت، طریقت، جہاد فی سبیل اللہ اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد کے وہ چشمے پھوٹے جن سے برصغیر پاک و ہند سرسبز و شاداب ہو گئے۔ اہلِ سرحد ہمیشہ مسلمان فاتحین اور غازیوں کے لشکر کے ہراول دستوں میں شامل رہے ہے۔ برصغیر کی سیاست میں انہوں نے شاندار کردار ادا کیا۔ رامپور، فرخ آباد، روہیل کھنڈ اور بھوپال کی اسلامی ریاستیں قائم کیں، جب کبھی دین پر کوئی کڑا وقت آیا۔ یہی پختون اسلام کی ڈھال بن گئے۔ شہنشاہ اکبر کے "دینِ الٰہی" کی سیاہی کو مٹانے کے لئے انہوں نے امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانی کا بھرپور ساتھ دیا۔ غازیٔ اسلام احمد شاہ ابدالی کے فاتحانہ لشکر میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے انہوں نے مرہٹوں کے "رام راج" کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ فرنگی کے خلاف مسلسل ڈیڑھ سو برس تک نبرد آزما رہ کر انہوں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا تو آزادیٔ وطن کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں وہ آگے آگے رہے ہے۔ پٹھانوں میں دین اسلام سے محبّت کرنے اور قومی زندگی میں انہیں باعزّت مقام دلانے میں مشائخ کرام اور صوفیائے عظام کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور ان محسنوں کی جتنی بھی قدر افزائی کی جائے کم ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی جغرافیائی پوزیشن اور اُفتادِ طبع کی وجہ سے پٹھان کو مسلسل اور متواتر جنگوں اور خون ریزیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ ان کے ہاتھ میں شمشیر و سنان اور طبل و علَم تو دکھائی دیئے لیکن قلم و قرطاس کی طرف توجہ دینے کا موقع انہیں نہ مل سکا کسی وقت بھی انہیں آرام سے بیٹھنے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں کو محفوظ کرنے کے لئے وقت میسّر نہ آیا۔ اگرچہ یہاں کے مشائخ کرام اور مشاہیر نے شاندار کارنامے انجام دیئے تھے لیکن معرضِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے وہ کارنامے عوام کے سامنے نہ آ سکے۔ یہاں تک کہ غوثِ خراسان، ہادیٔ گم گشتگان، حامیٔ سنّت، ماحیٔ بدعت سیّد علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا بونیری علیہ الرّحمۃ جیسی عظیم ہستی کے حالات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا رہا۔ چند کتابچے شائع ہوئے بھی تو وہ ان کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان ہرگز نہ تھے۔ اس لئے اس امر کی

7784

ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ اس سرتاج اولیاء۔ سلطان الاصفیاء کی حیات و تعلیمات سے عوام کو آگاہ کیا جائے ـــ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ کرے شرف قبولیت پائے۔

اس کتاب کی تالیف میں سب سے زیادہ بھروسہ مدبّر سیاستدان اور محقق تاریخ دان سید عبدالجبار شاہ ترمذی ستھانوی کی خود نوشت پر کیا گیا ہے ـــ مورخ سرحد علامہ قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کی نگارشات بھی ہمارے لئے مشعل راہ بنی رہیں اور مرحوم سجادہ نشین دربار پیر باباؒ بونیری سیّد معین الدین باچا کا مرتب کردہ "تذکرہ" بھی ممد و معاون ثابت ہوا۔ ہم ان سبھی حضرات کی خدماتِ جلیلہ کے دلی معترف ہیں۔

دنیا میں کوئی انسانی کوشش بھی تکمیل کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی کا اعتراف ہے ـــ قارئین کرام سے التماس ہے کہ مجھے میری غلطیوں اور فروگذاشتوں سے مطلع کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن مرتب کرتے وقت ان مشوروں اور نکات پر عمل کیا جا سکے۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب فضیلت مآب الحاج سید محمود شاہ صاحب ترمذی کی تحریک پر اور انہی کی نگرانی میں لکھی گئی ـــ شجرۂ نسب اور آخری ابواب بھی انہوں نے ہی مرتب کئے اور کتاب کی اشاعت و طباعت کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ ان کی سرپرستی ہی کتاب کی تالیف کا سبب بنی۔

مخدومیؒ محترم اعلیٰ حضرت حافظ الحاج قاضی محمد عبدالدائم دامت برکاتہٗ نے کمال مہربانی سے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ خداوند کریم انہیں جزائے خیر دے اور ان کی مخلصانہ مساعی کو قبول فرمائے۔

خادم: محمد شفیع صابر

۲/۳ خالد لین، فورٹ روڈ
پشاور چھاؤنی



کوئی مذہب دعوت و تبلیغ کے بغیر اشاعت نہیں پا سکتا، نہ کسی مذہب کا وجود دعوت و تبلیغ کے بغیر دیرپا ہو سکتا ہے، اسی لئے جہاں اسلام میں دعوت و تبلیغ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ وہیں مبلغینِ دین کو بہت عزت کا مقام بھی دیا گیا ہے — جن بزرگانِ دین نے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اسلام کو پھیلایا اُن میں سید علی غواص (پیر بابا) علیہ الرحمۃ کا مقام بہت بلند ہے۔

سید علی غواص ترمذی حسینی سیّد تھے، آلِ رسول سے عقیدت اور ان سے محبت ہمارے لئے لازمۂ ایمان ہے۔ پھر اس عظیم خانوادہ کی ہر وہ ہستی جو عالمِ ربانی اور عارفِ حقانی ہو، "نورٌ علیٰ نور" ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ واجب التعظیم اور قابلِ احترام ہے — ایسے عالمِ باعمل سیّد کی محبت اور بھی زیادہ باعثِ ثواب ہے۔

فضائلِ سادات

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالےٰ ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اُمّتِ مسلمہ کے ہر فرد کو کہدو کہ میں تم سے تبلیغِ رسالت و احکام کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے اقربا سے محبت اور ان کی عزّت کرو) صاحبِ کشّاف اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ! آپ کے قرابت دار کون ہیں جن

کی تعظیم ہم پر واجب قرار دی گئی ہے ۔۔۔؟" حضورؐ نے فرمایا۔ "علی، فاطمہ، حسن اور حسین اور ان دونوں کی اولاد۔۔۔"

کشاف کی ایک روایت یوں بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں " اپنے اللہ سے پیار کرو، ہر صبح اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔ مجھے اس لئے دوست رکھو کہ اللہ خود مجھے دوست رکھتا ہے اور میری خاطر اور میری خوشنودی کی خاطر میری اولاد سے محبّت کرو۔" اس سے معلوم ہوا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور جو اصل ایمان ہے اُسے حضورؐ کی خوشنودی کے لئے ان کی اولاد کو دل وجان سے زیادہ عزیز رکھنا ضروری ہے

صاحب کشّاف زاہد سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اہل بیت رسولؐ کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے، اللہ اس پر رحمتیں نازل کرتا ہے اور اس کے ساتھ نیکی اور شفقت کا برتاؤ کرتا ہے۔

کشّاف میں ایک دوسری جگہ یوں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا! اے لوگو! جان لو، جو کوئی محمدؐ کی اولاد سے محبت کرے گا، اس کا خاتمہ ایمان کامل پر ہوگا۔ جو شخص محمدؐ کی اولاد پر جان چھڑکے گا وہ پُل صراط سے ثابت قدمی سے گذرے گا کیونکہ محمدؐ کی اولاد کی محبت اور دوستی کی خاطر جان دینا شہادت کا مقام حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح جو کوئی میری اولاد کی محبت اور دوستی کی راہ میں جان ومال قربان کرے گا اسے اس زیب وزینت اور شان وشوکت سے جنت میں بھیجا جائے گا جیسے دلہن کو بناؤ سنگھار کے بعد شوہر کے ہاں بھیجتے ہیں۔۔۔ تم میں سے جو کوئی محمدؐ کے فرزندوں کی محبّت میں مرے گا۔ وہ اہل سنّت والجماعت کے طریقہ پر مرے گا اور "دُرّ" سے نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے جو شخص ہمیں یعنی مجھے اور میرے اہل بیت کو دوست رکھے اور میری اور ان کی تعظیم وتکریم کرنے والے کو محبوب رکھے، اللہ تعالےٰ اسے میرا ہم نشین بنائے گا گویا اس روایت میں عام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ

صحابہ کرام اہل بیت رسولؐ سے بہت ہی محبت کیا کرتے تھے ۔ علاوہ بریں اور بھی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن سے آپؐ کی اولاد سے محبت کے وجوب کی دلیل ملتی ہے ، ان مختصر صفحات میں ایسی حدیثوں کا اضافہ کرنا ناممکن ہے ۔

کتاب " اشرف النبوۃ " اور " دُرَر " میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن اور حسینؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ " جس نے مجھے اور ان دونوں بچوں کو اور ان کے ماں باپ کو دوست رکھا وہ قیامت میں ضرور میرے ہمراہ بہشت میں داخل ہوگا " ۔۔۔ اور یہ بھی فرمایا کہ " جس نے ہمارے اہل بیت کی محبت کو گلے لگایا اور ان کی محبت میں جان دی یا میری محبت میں مارا گیا وہ خوش قسمت اور قابلِ مبارک ہے اور ایسے شخص کے لئے جنت لکھ دی گئی ہے " ۔

" اشرف النبوۃ " میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا " قیامت میں میں چار قسم کے لوگوں کا شفیع ضرور بنوں گا خواہ وہ روئے زمین کے تمام گناہ ساتھ لے کر آئیں ۔۔۔ پہلا وہ گروہ جو میری اولاد کی محبت اور تعظیم کرے ، دوسرا وہ جو ان کی حاجت براری اور ضروریات پوری کرنے میں مصروف نظر آئے ۔ تیسرا جو ان کی پردہ پوشی کرنے والا ہو اور چوتھا وہ جو انہیں (اہل بیت کو) دل وجان سے عزیز رکھتا ہو ۔۔۔ مصابیح وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ۔

" میں تم میں دوؐ چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ، خدا کی کتاب اور اپنی عترت ۔ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ۔ میرے بعد گمراہ نہ ہو گے " ۔

" کشاف " اور " اشرف النبوۃ " میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے میرے اہلِ بیت پر ستم کیا اور میری اولاد کو ایذا پہنچائی اس پر جنت (یقیناً) حرام ہے ۔ مصابیح کے الفاظ یہ ہیں

کہ "فاطمہ رضؓ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اس کو ایذا پہنچانا مجھے ایذا پہنچانا ہے اور اسے ناراض کرنا مجھے ناراض کرنا ہے ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے " اگر میری اولاد میں سے کوئی نبی ہوتا تو میں خاتم الانبیاء نہ رہ سکتا ۔ اگرچہ میرے فرزند (حسنؓ اور حسینؓ) نبی نہیں ہیں پھر بھی جنت کے جوانوں کے سردار ضرور ہیں ۔"

ابن عساکر ابن نجار رضؓ حضرت حسن بن علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "دیکھو! میرے حسنؓ و حسینؓ کو برا نہ کہنا کہ وہ بہشت کے اولین اور آخرین لوگوں کے سردار ہیں ۔" ضیاء حذیفہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جبریل نے مجھے خوشخبری اور مبارک دی کہ حسنؓ اور حسینؓ عرش کے دو گوہر نایاب ہیں ۔" ابن عساکر ابان و انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ " اہل مجلس میں سے کوئی بھی کسی کے لئے تعظیماً کھڑا نہ ہوا کرے ۔ البتہ حسنؓ اور حسینؓ اور ان کی اولاد کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا روا ہے ۔"

واضح ہو کہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (صاحب تفسیر بحر مواج) نے رسالہ مناقب اہل بیت میں بہت سی حدیثیں اس بارے میں نقل کی ہیں اور اس رسالہ کا ایک پورا باب خاص قیام و تعظیم اولاد رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں ہے ۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کوفی رح کے مناقب میں شیخ ابوسعید ماوردی لکھتے ہیں کہ آپ (امام اعظم ابو حنیفہ رح) سادات کرام کی توقیر و احترام اور علویوں کی تعظیم و اکرام کا اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس برپا تھی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ بہت سی دفعہ تعظیماً اٹھتے اور پھر بیٹھ جاتے ۔ لوگوں کو چونکہ اس کا ظاہری سبب معلوم نہ تھا اس لئے بالآخر انہوں نے دریافت کیا کہ مجلس میں جناب کے بار بار اٹھنے کا کیا سبب ہے ؟ ۔۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ کچھ بچے کھیل رہے ہیں ۔ ان میں ایک بچہ علوی ہے ، جب وہ سامنے سے گزرتا ہے تو تعظیماً اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ۔

جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شیخ امان اللہ پانی پتی کے احوال میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"کہ میرے والد شیخ سیف الدین رحمہ نے فرمایا کہ شیخ امان قدس سرہٗ جب طالبانِ دین کو سبق پڑھا رہے ہوتے اور سادات کے بچے کھیلتے ہوتے سامنے آجاتے تو تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے اور جب تک وہ کھیلتے رہتے آپ کھڑے ہی رہتے۔ لوگوں نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا۔

"امان کی کیا مجال ہے کہ اولادِ رسول ﷺ کھڑی رہے اور امان اُن کے سامنے بیٹھا رہے۔" اسی طرح حضرت امام شافعی رحمہ کے متعلق منقول ہے کہ وہ سادات کرام کے ادب و احترام میں اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ لوگوں نے انہیں "رافضی" کہنا شروع کر دیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:۔

لَوْ کَانَ رِفْضاً حُبُّ اٰلِ مُحَمَّدٍ   فَلْیَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اَنِّیْ رَافِضٗ

(اگر محض آلِ محمدؐ کی محبت رفض کہلاتی ہے تو دونوں جہان گواہی دیں کہ میں رافضی ہوں)

جہاں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ کہنا ہے کہ "میرے اہلِ بیت کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پاگیا" وہیں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "میرے اصحابؓ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کسی کی اقتداء کرو گے ہدایت کو پالو گے"۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان اور محبّت کے بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں لہٰذا اہلِ سنّت والجماعت (جس کے عقائد کو اپنائے بغیر کوئی مومن درجہ ولایت کو پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی سچا مومن کہلا سکتا ہے) کا ایمان ہے کہ جس طرح اہلِ بیتؓ کی محبّت مسلمان کا فرضِ منصبی ہے، اسی طرح اصحابِ رسولِ خدا کی دوستی کو باعثِ فخر و نجات سمجھنا بھی فرائض میں داخل ہے۔ یہ دونوں محبتیں لازم ملزوم ہیں اور ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جس طرح بمطابق فرمانِ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جو شخص اہلِ بیتؓ کی کشتی میں سوار ہوگیا، ساحلِ نجات پر پہنچ گیا اور جس نے اس میں بیٹھنے سے انکار کیا وہ گردابِ بلا میں پھنس کر غرق ہوگیا۔ اسی طرح حضورؐ کا یہ فرمان بھی آنکھوں کو روشنی بخشنے والا ہے کہ "میرے اصحابؓ روشن ستاروں کی طرح ہیں اور ان کا اقتدار باعث ہدایت ہے۔"

سوچنے کی بات ہے کہ جس طرح ستاروں کی روشنی اور رہنمائی کے بغیر گھپ اندھیری رات میں کشتی کا کنارے پر پہنچنا محال بلکہ ناممکن ہے، اسی طرح محبت اہلِ بیت کی کشتی بھی صحابہ کرام کی محبّت کی روشنی کے بغیر ایمان کے دریا میں ساحلِ مراد پر نہیں پہنچ سکتی۔

"لطائف" میں امام فخرالدین رازیؒ بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اہلِ بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کی محبت یکساں باعث فلاحِ دارین ہے۔ مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے چاروں خلفاء افضل البشر ہیں، ان کے بعد عشرۂ مبشرہ ہیں، جن میں یہ چاروں خلیفہ بھی شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد اہلِ بدر کو تمام صحابہ کرام پر فضیلت حاصل ہے جن کی تعداد ۳۱۳ ہے (اور جن میں چاروں خلیفہ اور عشرۂ مبشرہ شامل ہیں) قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالےٰ نے اہلِ بدر کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر کے برأت کی سند لکھ دی۔ اصحابِ بدر کے بعد اصحابِ اُحد ہیں، اُحد کا معرکہ وہ زبردست معرکہ تھا جس میں جناب سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور ستّر جلیل القدر صحابہؓ نے شہادت پائی۔ اصحابِ اُحد کے بعد سب سے بڑا مرتبہ اُن اہلِ ایمان کا ہے جنہوں نے ببول کے درخت کے نیچے اپنی عزیز جانیں اور اپنا مال اور اولاد اللہ اور اس کے رسولِ مقبولؐ کی راہ میں قربان کرنے کا اقرار اور عہد کیا ــــ جسے بیعتِ رضوان بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں وہ تمام صحابہ کرام شامل ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے ــ اس طرح ان اصحابؓ کی کل تعداد تیرہ سو کو پہنچتی ہے۔

جہاں تک مرتبہ و مقام کا تعلق ہے امت کے باقی تمام لوگوں میں صحابہ کرام کو فضیلت حاصل ہے، ہمارے علمائے سلف اور مشائخ خلف کا بھی یہی اعتقاد ہے ــــ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی اشاعت کا سہرا جن علمائے ربّانی اور مشائخ عظام کے سر ہے وہ سب اسی عقیدہ کے علمبردار تھے۔ خود حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمتہ بھی عمر بھر اسی عقیدے پر قائم رہے اور اسی عقیدے کی اشاعت و تبلیغ میں زندگی گذار دی ــــ وہ جہاں طالبان حق کو علوم ظاہری سے آراستہ کرتے وہیں انہیں معرفت الٰہی کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی بخشتے۔

حضرت پیر باباؒ کے نامور اسلاف

اعلیٰ حضرت غوثِ زمان سیّد علی غواص المعروف پیر باباؒ علیہ الرحمۃ کے نامور اسلاف کرامؒ میں ائمہ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی شامل ہیں تو دوسرے مشائخ کرام بھی۔ یہ سبھی حضرات اپنے اپنے دور کے صاحبانِ کمال اور شناسایانِ معرفت تھے اس لئے ان کے محامد و محاسن کا احاطہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس کے باوجود ہم تبرکاً حضرت پیر باباؒ کے ان اسلاف کرام کی اسلامی خدمات سے قارئین کرام کو روشناس کرانا ضروری گردانتے ہیں۔ مقصود اُن کی عظمت کا اعتراف اور ان کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہے، ان میں سے ہر صاحبِ کمال کی ذات وہ مینارۂ نور ہے جس کی روشنی طالبانِ حق اور متلاشیانِ معرفت کی ہمیشہ رہنمائی کرتی رہے گی۔

امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہٗ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچازاد تھے بلکہ انہیں حضور سرورِ کائناتؐ کا داماد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، حضور پُرنور کی صاحبزادی سیّدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ اُن کے عقد میں تھی ـــ اُن کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیرِ تربیت رہے، بعثت رسولؐ کے وقت ان کی عمر آٹھ دس برس کی تھی۔ بچوں میں سب سے پہلے آپؓ پر ایمان لانے میں انہیں اولیت کا فخر حاصل ہوا۔ ۳۵ھ ہجری میں مسند خلافت پر بیٹھے اور ۴۰ھ ہجری کے رمضان المبارک میں کوفہ کی مسجد میں شقی القلب عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں زخمی ہو کر شہید ہوئے ـــ ان کی ولادت اور شہادت کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے

کسے رامیسر نہ شد ایں سعادت　　بکعبہ ولادت، بہ مسجد شہادت

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کی رفعتِ علمی کے بارے میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے، اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے)۔ اُن کی عظمتِ شان کی گواہی بھی خود دنیا کی اس سب سے برگزیدہ ہستی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوں دی ہے۔ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (تو میرے نزدیک ایسا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کے لئے ہارونؑ — مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) حضور پُر نورؐ ہی کا ارشاد ہے مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ (غدیرِ خم کے موقع پر سردارِ انبیاءؐ نے فرمایا۔ میں جس کا مولیٰ (دوست) ہوں، علی بھی اس کا مولا ہے۔ خدایا جو علیؑ سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ)

امام الاولیاء حضرت علیؓ بارہ اماموں میں سے پہلے امام ہیں اور اکثر اولیائے کرام کا سلسلہ آپ پر منتہی ہوتا ہے۔

آپ کا روضہ باختلافِ روایات نجف اشرف (عراق) میں ہے

امیر المومنین حضرت امام حسنؓ

اگرچہ حضرت پیر باباؒ کا شجرۂ نسب والد کی طرف سے حضرت امام حسنؑ سے نہیں ملتا تاہم مادری سلسلوں کا تعلق اُن کی ذاتِ گرامی سے ضرور ہے۔ اسی لئے یہاں آپ کا ذکر بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

آپ دوسرے امام ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے بے حد عزت واحترام کے مالک ہیں۔ آپ کی ولادت ۳ھ

میں ہوئی۔ حضورؐ ہی کے ہاتھوں میں پلے بڑھے، انہیؐ کے اخلاقِ حسنہ کو اپنایا، یہاں تک کہ امام حسنؓ کے جسمِ اطہر کا اوپر والا آدھا حصہ یعنی سینہ مبارک سے سر تک اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بے حد مشابہ تھا۔ ۴۹ھ ہجری میں بیوی کے زہر دینے سے وفات ہوئی۔ مدینہ منورہ کے جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت امام حسینؓ۔

حضرت امام حسینؓ، حضرت علیؓ کے دوسرے صاحبزادے اور بارہ اماموں میں سے تیسرے امام ہیں، ان کا سالِ ولادت ۴ھ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بذریعہ وحی اُن کا نام حسینؓ رکھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے "حسن" کا نام بھی حضورؐ بذریعہ وحی تجویز کر چکے تھے۔ امام حسینؓ کے جسم کے نچلے دھڑ میں حضورؐ سے مشابہت رکھتے تھے۔

پیغمبرِ اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں جنتیوں کے سردار ہیں"۔ نیز فرمایا کہ "میری نسل انہی دو صاجزادوں سے چلے گی" اسی لئے ان کی اولاد کو شرفِ سیادت حاصل ہے اور اللہ نے اس میں بڑی برکت دی ہے۔

حضرت امام حسینؓ نے دس محرم الحرام ۶۱ھ کو جمعہ کے دن کربلا کے مقام پر شہادت پائی، کہتے ہیں کہ ان کی شہادت کے دن بیت المقدس کے جس پتھر کو اٹھایا جاتا اس کے نیچے سے تازہ خون ملتا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ شہادت کے دن آسمان سرخ ہو گیا تھا۔

امتِ محمدیہ کے تمام علماء، صلحاء اور شعراء نے حضرت امام حسینؓ کے حضور بڑے ادب سے نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، ایک بزرگ کا کہنا ہے :۔

؎ شاہ است حسین بادشاہ است حسین — دیں است حسین دیں پناہ است حسین
سر داد و نداد دست در دستِ یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حکیم الامت اقبال حضرت امام حسینؓ کی شان میں کہتے ہیں۔

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ　　　سروِ آزادے زبستانِ رسولؐ

بہرِ دیں درخاک و خوں غلطیدہ است　　　تابنائے لاالٰہ گردیدہ است

نقشِ الّا اللہ بر صحرا نوشت　　　حرفِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

تاقیامت قطعِ استبداد کرد

موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

حضرت امام علی زین العابدینؓ۔ امام علی زین العابدینؓ حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے اور بارہ اماموں میں سے چوتھے امام ہیں۔ سانحۂ کربلا پیش آیا تو ان کی عمر تقریباً تیئیس ۲۳ سال کی تھی، چونکہ اس وقت علالت کی وجہ سے صاحب فراش تھے اس لئے جنگ میں حصّہ نہ لے سکے، عبادت اس کثرت سے کرتے تھے کہ اُن کا لقب "زین العابدین" پڑگیا۔ روایت ہے کہ ہزار رکعت نفل روزانہ پڑھا کرتے تھے۔ وضو فرماتے تو ان کا چہرہ زرد پڑجاتا اور جسم اطہر پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ کسی نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا فرمایا، "تم جانتے ہو کس کے حضور میں حاضری کا وقت ہے؟" وفات ۹۵ ہجری میں ہوئی، مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت امام حسینؓ کا سلسلۂ نسب حضرت امام زین العابدین ہی سے جاری ہوا۔ اللہ کی شان ہے کہ اکیلے امام زین العابدینؓ سے چلنے والی نسل کو کس قدر برکت اور کثرت دی۔ آج دنیا کے ہر گوشہ میں کتنے سیّد آباد ہیں، اس کے برعکس یزید کے پندرہ بیٹے تھے لیکن وہ مقطوع النسل ہوگیا اور آج دنیا میں اس کا کوئی نام لیوا تک نہیں۔

حضرت امام محمد باقرؓ حضرت امام محمد باقرؓ حضرت امام زین العابدینؓ کے

صاحبزادے اور جانشین ہیں، ان کی ولادت مدینہ منورہ میں، ۵۷ ہجری میں یعنی سانحۂ کربلا کے قریباً تین سال پیشتر ہوئی —— ان کی والدہ ماجدہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی فاطمہ رضؓ تھیں۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا تو آپؐ نے فرمایا " اے جابر! تم اس وقت موجود ہوگے جب میری اولاد میں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جس کا نام محمد بن علی بن حسینؓ ہوگا۔ اللہ تعالےٰ اس کو نور و حکمت عطا فرمائے گا۔ تم اس سے ملو تو میرا سلام کہہ دینا۔"

حضرت امام باقر رضؓ نے ۱۱۴ھ ہجری میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مزارِ مبارک جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق رضؓ۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہٗ بارہ اماموں میں سے چھٹے امام اور امام باقر کے صاحبزادے ہیں۔ والدہ ماجدہ کا نام امّ فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ ہے۔ یہ ام فروہ اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں۔ امام جعفر صادقؓ کی ولادت ۸۳ ہجری میں ہوئی۔ حضرت امام جعفر صادقؓ کو خرقۂ شرف و فضیلت دونوں طرف سے حاصل ہے ایک باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے اور دوسرے اپنے نانا حضرت قاسم رضؓ سے۔ حضرت قاسم رضؓ کی نسبت حضرت سلمان فارسیؓ سے تھی اور حضرت سلمان فارسیؓ کی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے —— اسی لئے آپ اس دوہری نسبت پر فخر فرمایا کرتے تھے۔ ان کا قول ہے وَلَدَنِی اَبُوْبَکْرٍ مَرَّتَیْنِ (میری ظاہری اور باطنی ولادت و نسبت حضرت ابوبکرؓ سے دوہری ہے) آپ کی ذاتِ اقدس میں سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ اور دوسرے سلاسلِ طریقت اکھٹے ہوگئے ہیں گویا آپ طریقت کے مجمع البحرین ہیں (یعنی صدیقی اور علوی دونوں نسبتوں کا مخزن ہیں) حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہؒ حضرت امام جعفر صادقؓ کے شاگرد اور مرید ہیں۔

امام جعفر صادق رضؓ کی وفات ۱۴۸ ہجری میں ہوئی۔ آپ جنت البقیع کے قبہ اہل بیت میں دفن ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری (لاہوری) علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ اتنے علو مرتبت کے باوجود آپ کی عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار اپنے موالیٰ (غلام) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو فرمایا "آؤ! ہم عہد کریں کہ ہم میں سے جس کی نجات روزِ قیامت پہلے ہو جائے وہ باقی سب کی سفارش کرے"۔ حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا "اے ابن رسول اللہ! آپ کو ہماری سفارش کی کیا حاجت؟ خود آپؐ کے نانا محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم تو تمام مخلوق کی سفارش فرمائیں گے"۔ اس پر آپ نے ارشاد کیا "میں اپنے اعمال و افعال پر غور کرتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ قیامت کے دن اپنے نانا جان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔ سبحان اللہ! اللہ والوں کی کیا ہی باتیں ہیں۔ پندارِ علم اور غرورِ زہد ان کے قریب تک نہیں پھٹکتا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم رضؓ

حضرت موسیٰ کاظم رضؓ ساتویں امام اور حضرت امام جعفر صادق رضؓ کے فرزند ہیں، آپ دوسرے آئمہ اہل بیت کی طرح علم وفضل کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے، زہد و عبادت، جود و سخا، صبر و شکر کی خوبیاں آپ کو اپنے عظیم آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی تھیں طبیعت میں شان عفو اور حلم کو بڑا عمل دخل تھا، ہمیشہ غصہ و غضب سے بچے رہتے اسی لئے آپ کو کاظم (غم و غصہ کو پی جانے والا) کہا جاتا تھا۔

معاندین نے آپ پر بڑی سختیاں روا رکھیں مگر اللہ نے انہیں بڑی برکت اور کثرت اولاد سے نوازا۔ کئی روایات ہیں کہ ان کے بیس بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں تھیں اولاد کا سلسلہ چودہ بیٹوں سے چلا آپ کے فرزندوں میں سے اکثر نے علم وفضل کی دنیا میں بڑا نام پایا۔ بالخصوص ان کے فرزند امام علی رضاؑ کا علمی مقام بہت ہی بلند ہے۔ امام موسیٰ کاظم رضؓ کا سال ولادت ۱۲۸ ہجری اور سال وفات ۱۸۳ ہجری ہے۔ آن

کا مرقدِ مبارک بغداد کے محلہ کاظمین میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت امام علی رضاؓ

حضرت امام علی رضاؓ کا مقبرہ مملکت ایران کی سب سے بارونق اور مقدس زیارت گاہ ہے، روضہ مہبطِ انوار بھی ہے تو ظاہری جمال و آرائش کے اعتبار سے فنِ تعمیر کا شاہکار بھی۔

حضرت امام علی رضاؓ گیارہ ذی قعدہ ۱۵۳ ہجری کو مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے وہ حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کے صاحبزادے تھے، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت موسیٰ کاظمؓ ہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ وہ اسی پاکیزہ اور نورانی ماحول میں پلے بڑھے۔ امام علی رضاؒ علم و فضل کے اعتبار سے بھی امتیازی شان کے مالک تھے اور زہد و اتقاء میں بھی انتہائی بلندیوں پر فائز تھے۔ سلسلۂ امامیہ کے پیروکاروں کے نزدیک وہ مجدّد کے رتبے پر فائز تھے۔ خود عبّاسی خلیفہ مامون الرشید بھی ان کے علمی کمالات کا معترف تھا، بتایا جاتا ہے کہ عبّاسی خلیفہ ان کا اتنا قدر دان تھا کہ اس نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی بلکہ امام علی رضا کو اپنا جانشین بھی نامزد کیا عباسی حکمران کی خواہش پر امام علی رضاؓ مدینہ منوّرہ سے خراسان منتقل ہو گئے ان کا روضہ ایک قریہ میں طوس کے نواح میں تھا لیکن بعد میں امیر تیمور اور اس کے جانشینوں نے روضہ کے گرد خوبصورت عمارات تعمیر کرائیں اور یہاں ایک بہت بڑا شہر آباد ہو گیا جو مشہد امام رضاؓ کہلایا۔ آپ کی وفات کا سال ۲۰۳ ہجری ہے۔

ان کی وفات کے متعلق منقول ہے کہ ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید نے انہیں اپنے ہاں بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو مامون کے سامنے پھلوں سے بھری ہوئی طشتریاں رکھی تھیں اور خلیفہ انگور کا ایک خوشہ ہاتھ میں لئے کھا رہا تھا حضرت امام علی رضاؓ کے آنے پر مامون اٹھ کھڑا ہوا، معانقہ کیا، پاس بٹھایا اور انگور کا خوشہ

انہیں پیش کرتے ہوئے عرض کی کر "اے ابن رسول اللہ! کیا اس انگور سے بہتر انگور آپ نے دیکھا ہے؟" آپ نے فرمایا "اچھے انگور بہشت میں ہوتے ہیں۔" پھر مامون نے اصرار کیا کہ وہ کچھ انگور کھائیں۔ پہلے تو امام نے انکار کیا۔ بالآخر مامون الرشید کے اصرار سے انگور کے دو تین دانے کھائے، باقی رکھ دیئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ مامون نے دریافت کیا "کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟" فرمایا "جہاں جانے کا حکم دیا گیا۔" باہر چلے آتے۔ ایک کمرے میں تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ اس اثنا میں اُن کے صاحبزادے امام محمد تقیؓ مدینہ طیبہ سے آپہنچے امام علی رضاؓ نے انہیں سینے سے لگایا۔ آنکھوں کو بوسہ دیا، اپنے بستر پر اپنے پاس لٹایا۔ دونوں منہ سے منہ لٹا کر لیٹ گئے اور کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ اسی حال میں تھوڑی دیر بعد آپ راہی ملک بقا ہو گئے۔

حضرت امام محمد تقی جوادؓ۔

حضرت امام محمد تقی اپنے سلسلے کے نویں امام اور حضرت امام علی رضاؓ کے صاحبزادے ہیں۔ ولادت ۱۹۵ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور وفات معتصم باللہ کے عہد حکومت میں ۲۲۰ ہجری کو۔ ان کا روضہ اقدس بغداد کے علاقہ کاظمین الشریفین میں اپنے جدّ امجد امام موسیٰ کاظم علیہ الرحمۃ کے پہلو میں واقع ہے، اپنی تعمیر کے اعتبار سے ان کا روضہ نہایت ہی خوبصورت اور دلکش عمارت ہے جہاں صبح شام زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

منقول ہے کہ بچپن میں آپ دوسرے بچوں کے ساتھ بغداد کے کسی کوچہ میں کھیل رہے تھے کہ اتفاقاً عباسی خلیفہ مامون الرشید شکار کو جاتے ہوئے اُدھر سے گذرا۔ خلیفہ کی سواری کو دیکھتے ہی تمام بچے ادھر ادھر کھسک گئے لیکن امام محمد تقی اُسی جگہ کھڑے رہے جب مامون نے انہیں دیکھا تو گھوڑا روک کر ان سے پوچھا "لڑکے! تم دوسرے بچوں کے ساتھ کیوں نہیں بھاگے؟" آپ چونکہ بچپن ہی سے بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے، اس لئے بلا جھجک جواب دیا۔ "امیرالمومنین! راستہ تنگ نہیں، کافی کشادہ ہے! میرے یہاں کھڑے ہونے سے کوئی رکاوٹ

پڑتی تھی۔ پھر میں کیوں بھاگتا ؟" مامون کو آپ کی معصوم گفتگو اور بھولی بھالی پاکیزہ صورت بہت بھلی لگی ۔ پوچھا "نام کیا ہے تمہارا ؟" جواب دیا "محمد" ۔ پوچھا "کس کے بیٹے ہو ؟" کہا "امام علی رضاؓ کے !" خلیفہ انہیں ساتھ لے گیا ۔ بعد میں اس نے اپنی بیٹی ام الفضل آپ کے نکاح میں دے دی !"

آپ کی اولاد کا سلسلہ امام علی نقی الہادی اور موسیٰ ابرقع سے جاری ہے ۔

امام علی نقی الہادیؓ۔ امام علی نقی الہادیؓ سلسلۂ امامیہ کے دسویں امام تھے ، آپ حضرت امام علی نقیؓ کے فرزند ارجمند تھے ، والدہ کا نام سیدہ ام الفضل تھا ، اپنے نامور آباؤ اجداد کی طرح حضرت امام علی نقیؓ بھی ظاہری اور باطنی علوم میں نہایت ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور اپنے اخلاق عالیہ کی بدولت عوام میں بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ امام علی نقیؓ پانچ رجب ۲۱۴ ہجری کو مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے ۔

امام علی نقیؓ کا زمانہ عباسی خلیفہ متوکل باللہ کا دورِ حکومت تھا ۔ متوکل باللہ نے مکان کے ایک حصہ میں مختلف قسم جانور پال رکھے تھے ، یہ جانور اور پرندے ہر وقت بھانت بھانت آوازیں نکالتے اور اتنا شور مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی تاہم جب کبھی امام علی نقیؓ وہاں تشریف لاتے تو سب جانور پاسِ ادب سے بالکل خاموش ہو جاتے ۔ جونہی آپ مکان سے رخصت ہوتے ، پرندے اور جانور پھر اسی طرح شور مچانے لگتے ۔

حضرت امام علی نقی نے سہ رجب ۲۵۴ ہجری کو داعئ اجل کو لبیک کہا ، ان کا مزار ایک پُر فضا مقام سامرہ میں ہے جو بغداد سے ستر میل شمال کو موصل جانے والی سڑک پر واقع ہے ۔ سامرہ کچھ عرصہ تک خلفائے عباسیہ کا دارالحکومت رہ چکا ہے ، یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے ۔

امام علی نقیؓ کی اولاد کا سلسلہ امام حسن عسکریؓ ، جعفر ثانی اور ابو جعفر محمدؓ سے

آگے بڑھنا ہے۔

امام حسن عسکریؓ

امام حسن عسکریؓ اپنے سلسلے کے گیارہویں امام ہیں، وہ حضرت امام علی نقیؓ کے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ امام حسن عسکری جمعہ دس ربیع الثانی ۲۳۲ ہجری میں مدینہ منورہ میں تولد ہوئے۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی، تاہم آپ امام عسکری کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا نام حدثیہ خاتون تھا، جب آپ کی ولادت ہوئی تو واثق باللہ بن معتصم باللہ برسر اقتدار تھا، ابھی آپ کی عمر چار ماہ کی تھی کہ والد نے انہیں اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ جب ان کے والد بزرگوار امام علی نقیؓ کو سامرہ بلایا گیا تو آپ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔

حضرت امام حسن عسکری سے کئی کرامات سرزد ہوئیں۔ آپ کے اقوال بڑے شہرہ آفاق ہیں اور حکمت کا خزانہ سمجھے جاتے ہیں۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے قید کی سختیوں اور تکلیفوں سے تنگ آکر حضرت امام حسن عسکریؓ کو شکایت نامہ لکھ بھیجا تاہم شرم اور خود داری کی وجہ سے اپنی تنگدستی کا حال نہ لکھ سکا۔ آپ نے میرے خط کا جواب عطا فرمایا۔ جس میں تحریر تھا کہ آج انشاء اللہ تم نماز ظہر اپنے گھر جا کر ادا کرو گے۔ چنانچہ نماز ظہر سے قبل ہی مجھے قید سے رہائی مل گئی اور نماز ظہر میں نے گھر پر جا کر ادا فرمائی۔ نماز سے فارغ ہوا کہ ایک شخص نے دروازے پر دستک دی، وہ حضرت امامؓ کا قاصد تھا۔ اس نے امام حسن عسکریؓ کا ایک خط اور ایک سو دینار مجھے دیئے۔ خط میں بھی لکھا تھا کہ جب تمہیں ضرورت ہو مجھ سے کوئی چیز طلب کرنے میں شرم نہ کیا کرو۔ جو چاہو گے انشاء اللہ تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔

شیعہ روایات کے مطابق امام حسن عسکری کی شادی والد گرامی نے اپنی وفات سے قبل ہی محترمہ نرجس خاتون سے کر دی تھی جو قیصرِ روم کی پوتی اور شمعون وصی حضرتِ عیسیٰ کی نسل سے تھیں۔

حضرت امام عسکری جمعہ ۸ ربیع الاول ۲۶۰ ہجری کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

انہیں اپنے گرامی قدر والد کے پہلو میں سامرہ ہی میں سپرد خاک کیا۔ آپ کے مزار پر بعد میں بہت خوبصورت مقبرہ تیار کیا گیا جہاں ہر روز دور دور سے ہزاروں زائرین آتے ہیں اور دونوں اماموں کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آپ کے تین فرزند ہوئے ہیں۔ قاسم۔ ابو عبداللہ علی اکبر اور محمد مہدی ۔۔ آپ کی اولاد کا سلسلہ جناب ابو عبداللہ علی اکبر سے چلا۔

حضرت پیر بابا سیّد علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے اسلاف گرامی میں دوسرے لوگ بھی اپنی روحانیت اور اخلاق پاکیزگی میں بھی بڑی شان کے مالک ہو گذرے ہیں۔ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ یوں ہے۔

سیّد جلال گنج علم بخاریؒ

سرزمین سرحد اور افغانستان کے مشہور دینی پیشوا سید جلال گنج علم بخاری نہ صرف دنیائے طریقت کی ایک ممتاز ہستی تھے بلکہ مجاہد فی سبیل اللہ کے طور بھی انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ سلطان محمود غزنوی کے لشکر میں شامل ہو کر جہاد بالکفار میں مصروف رہے اور انہی معرکوں میں سے ایک میں شہادت کا درجہ پایا۔ آپ کا مزار مبارک موضع تالاش علاقہ دیر میں ہے۔

سیّد ناصر خسروؒ

سیّد ناصر خسروؒ صاحب کمال و کرامات تھے۔ "حیات المیر" اور "زندہ پیر" کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ آپ نے سرزمین سرحد میں کئی مقامات پر قیام فرمایا اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ معتقدین نے بہت سی جگہوں پر جہاں جہاں آپ نے قیام فرمایا۔ آپؒ کی یادگاریں تعمیر کر دی ہیں ۔۔ ایک ایسی ہی زیارت تبت میں بھی ہے

"تذکرہ سلطان الاولیاء کے مطابق سیّد ناصر خسروؒ سوات کے پہاڑوں رانولیا

اور رج شوئی وغیرہ علاقوں میں بھی کفار کے خلاف جہاد میں مصروف رہے اور چیلاس اور تانجیر تک بھی گئے ۔ اس راہ میں انہوں نے اپنی جان بھی قربان کر دی ۔ بتایا جاتا ہے کہ سیّد ناصر خسرو ۴۸۱ ہجری کے قریب شہید ہوئے ۔

سیّد احمد بیغم رح مشہور بزرگ تھے، دُنیوی وجاہت کے اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے، بتایا جاتا ہے کہ امیر تیمور کی ہمشیران کے عقد میں تھیں ۔ حضرت پیر بابا رح کی پانچویں پشت میں جدِّ امجد سید محمّد نور بخش ترمذی شاید اسی شہزادی کے بطن سے تھے ۔

سیّد محمد نور بخش ترمذی رح[1]، سیّد یوسف نور رح، سیّد احمد نور رح سید محمد نور بخش ترمذی رح سیّد یوسف نور رح اور سیّد احمد نور رح بھی اپنے اپنے وقت کے کاملین میں شمار ہوتے ہیں ۔ یہ حضرات نہ صرف اپنے علم وفضل کے اعتبار سے قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے ۔ بلکہ پشت در پشت سے سلسلہ کبرویہ میں ماذون اور مجاز تھے، ان لوگوں کے ارادت مند سارے افغانستان، خراسان اور سرحدی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، مغلیہ خاندان کے حکمرانوں سے قرابت داری اور اپنے زہد وعبادت اور تقویٰ کی وجہ سے لوگوں میں بڑے مقبول اور ہر دلعزیز تھے ، حضرت پیر بابا سید علی غواص ترمذی رح کو اس سلسلہ طریقت کی خلافت اپنے محترم

---

[1] سید السادات محمد نور بخش علیہ الرحمتہ کا انتساب سلسلہ کبرویہ میں حضرت ابو اسحاق ختلانی سے تھا جو قطب الاقطاب سید امیر کبیر علی ہمدانی علیہ الرحمتہ کے داماد، خلیفہ ماذون اور جانشین تھے، آپ نے سرزمینِ ایران میں تصوف کے ایک نئے سلسلے کو فروغ دیا تھا جسے نور بخشیہ سلسلہ کہا جاتا تھا ان کے اور ان کے خلفاء کے ارادت مند خراسان، ایران، افغانستان اور ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے ۔ ہندوستان میں حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی (مدفون دہلی) نے

دادا حضرت سیّد احمد نور بن سیّد یوسف نور بن سیّد محمد نور بخش ترمذیؒ سے حاصل ہوئی تھی۔

سیّد قنبر علیؒ

سید قنبر علیؒ پیر بابا سیّد علی غواصؒ کے والد محترم تھے۔ وہ مغل حکمران شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے بہنوئی تھے۔ بعد میں شہنشاہ ہمایوں کی فوج میں سپہ سالار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ انہیں شاہی دربار سے امیر نسلر بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ان کے نام کے ساتھ میرزا بھی لکھا جاتا ہے جو اس دور میں ان لوگوں کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا جن کی قرابت شاہی خاندان سے ہو۔ آپ قندوز سے نقل مکانی کر کے علاقہ تبریز کے موضع غلطان میں آباد ہو گئے تھے۔ اسی مقام کو حضرت پیر بابا سید علی غواص ترمذی علیہ الرحمۃ کی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

٭ ایک مشہور و معروف وسیع الحلقہ شیخ طریقت گذرے ہیں، جن کو اس سلسلہ کبرویہ کا فیض انہی (سید محمد نور بخش ترمذیؒ) سے پہنچا تھا۔

۲

حیاتِ مُبارکہ پیر باباؒ

ولادت :- ۹۰۸ ہجری : ۱۵۰۲ عیسوی
وفات : ۹۹۱ ″ : ۱۵۸۳ ″

مادہ تاریخ وفات: سیّد علی غواص نورِ الٰہی
۱۵۸۳ء

"یوسف زئی قوم بھی کیا خوش قسمت قوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ولیٔ کامل نے ہندوستان سے ایک غوثِ وقت کو اُن کی اصلاح کے لئے بھیجا۔
اُس کی ذات سنگ پارس تھی جو اُس کے ساتھ لگا اُس نے اُسے سونا بنا دیا۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو حضرت اخون درویزہ باباؒ نے اپنی ایک تصنیف کے دیباچہ میں پیر بابا حضرت سیّد علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے بارے میں کہے۔ اور حقیقت ہے بھی یہی۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی دولت ایمان ہے، دُنیا دار العمل اور آخرت کی کھیتی ہے۔ جو یہاں سے ایمان سلامت لے گیا نور و فلاح پا گیا۔ جس کا ایمان اور عقائد بگڑے، اُس کا اخلاق بھی غارت ہوا۔ اخلاق اور عقائد میں لغزش ہوئی تو انسان پھسل کر تحت الثریٰ میں جا گرا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جس سب سے بڑی نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ حضور آقائے نامدار، سیّد المرسلین، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی انسانی دنیا میں تشریف آوری ہی تو ہے، سلسلۂ نبوت آپ کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوا تو اللہ نے اپنے دین کی اشاعت کا سامان یوں کیا کہ خود اسی اُمت کے صلحاء، علماء اور اتقیاء آگے بڑھے۔ اور انہوں نے پرچم اسلام کو تھام لیا۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی روشنی انہی نفوسِ قدسیہ کی بدولت پھیلی۔ شہنشاہوں کو اپنی سیاسی سرگرمیوں ہی سے فرصت کہاں تھی۔ ایسے میں ان اللہ والوں کا دم غنیمت تھا، جنہوں نے ہمہ تن اپنے آپ کو اسلام کے فروغ و اشاعت کے لئے وقف کئے رکھا۔ پہلے اُنہوں نے اپنی اصلاح کی ـــــ اُن کی اخلاقی برتری اور رُوحانی پاکیزگی دوسروں کے لئے مشعلِ راہ اور نمونہ بن گئی ـــــ چراغ سے چراغ جلتا رہا اور یوں سارا کفرستانِ ہند اسلام کے نور سے منّور ہو گیا۔

جن لوگوں کو بونیر اور کوہستان سوات کی جغرافیائی پوزیشن کا علم ہے، وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چار پانچ سو سال پہلے ان دُور افتادہ جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ کوئی مبلغ اسلام یا عالم دین وہاں پہنچنے نہ پایا تھا ـــــ لوگ اپنے صدیوں پُرانے مذہبی عقائد اور رسم و رواج پر قائم تھے۔ اور اپنی ہی دنیا میں مگن حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے ـــــ ایسے میں ہزاروں میل دُور اجمیر میں بیٹھے ہوئے ایک مردِ خدا ـــ جن کی باطن کی آنکھیں روشن تھیں، تاڑ گئے کہ ان پہاڑوں میں گھرے ہوئے انسانوں کو رہبری اور رہنمائی کی ضرورت ہے ـــــ اپنے مرشد کامل حضرت شیخ سالار رومیؒ کی ہدایت پر سید علی ترمذی 'پیر بابا علیہ الرحمۃ پہلے پشاور میں اور پھر کوہستان بونیر و یوسف زئی پہنچے ـــ اُنہوں نے عرصہ دراز تک انتہائی خلوص، بے غرضی اور ایثار سے ان علاقوں میں دینِ اسلام کے فروغ و اشاعت کے لئے کام کیا اور بالآخر سارے صوبہ سرحد، قبائلی اور کوہستانی علاقوں، گلگت، چلاس اور افغانستان کے مصلحِ اعظم کہلائے اور غوثیت اور قطبیت کے بلند مقام تک پہنچے۔ آج تک اُن کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

حضرت پیر باباؒ اگرچہ عالم فاضل انسان تھے، جامع شریعت و طریقت تھے، بڑے بڑے علماء سے اُن کے مناظرے اور محاولے ہوتے رہے، اس لئے گمان غالب ہے کہ اُن کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں بھی ضرور ہوں گی۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی کتاب اب تک دستیاب نہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے جانشینوں میں ایک صاحبِ کمال شخص سید عبدالجبار شاہ آف ستھانہ نے بڑی جستجو کی، وہ سارے کوہستانی علاقوں میں پھرے، افغانستان کے مقام قندز تک گئے، کونڑ میں پیر باباؒ

کے جانشینوں تک پہنچے مگر پیر باباؒ کی کوئی تصنیف اُن کے ہاتھ نہ آسکی۔ بہر حال سیّد عبدالجبار شاہ نے اتنا ضرور کیا کہ پیر باباؒ کے بارے میں جو جو مصدقہ حالات مل سکے انہیں اپنی خود نوشت بعنوان "عبرۃ لاولی الابصار" کی صورت مرتب اور مدوّن کر دیا۔ شاہ صاحب مرحوم کو حالات نے اجازت نہ دی کہ فراغت سے بیٹھتے اور ان جمع شدہ معلومات سے فائدہ اُٹھاتے تاہم انہوں نے ایک بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اور یہی ان کا مقصد تھا، اس بارے میں لکھتے ہیں :۔

"جو معلومات میرے ذہن میں ہیں انہیں ترتیب دے دینا ہی بہتر ہے، اگر زندگی میں مجھے خود موقع ملا تو خود ان کی نوک پلک سنوار لوں گا۔ ورنہ میری اولاد میں سے جس کسی کو توفیق ملی یا کسی اور مردِ صالح نے چاہا تو اس ملبہ اور خام مواد کو کام میں لاکر اس سے تاریخ سرحد کی عمارت کھڑی کر سکے گا۔"

صوبہ سرحد اور قبائل کی تاریخ سے قطع نظر جہاں تک سیّد علی ترمذی (پیر بابا) علیہ الرحمۃ کی حیاتُ تعلیمات کا تعلق ہے، سیّد عبدالجبار شاہؒ نے بھی زیادہ تر حضرت اخون درویزہؒ ہی کی تحریروں پر انحصار کیا ہے اور بات ہے بھی یہی کہ اخون درویزہؒ ایک فاضل بزرگ تھے، وہ برسوں تک اپنے مُرشد گرامی حضرت پیر باباؒ کے ساتھ سایہ کی طرح رہے، وہ اُن کے ماذون اور خلیفہ بھی تھے اور اُن کے مشن کو آگے بڑھانے والے بھی۔ اُنہوں نے پیر باباؒ سے جو باتیں سُنیں، انہیں احاطۂ تحریر میں لے آئے ۔ اِن اوراق میں بھی اخون درویزہ باباؒ ہی کی تحریروں کو سند سمجھتے ہوئے انہیں بنیاد بنایا گیا ہے

نام و نسب

حضرت پیر باباؒ افغانستان کے علاقہ کنڑ کے مقام قندز یا قندوز کے ایک نامور حسینی سادات گھرانے کے فرد تھے، سادات کا یہ گھرانہ ہر دور میں سارے افغانستان، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ کابل کے حکمران اس خاندان کے نہ صرف ارادت مند رہے بلکہ اپنی بیٹیاں اِس خاندان میں بیاھنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے رہے۔ اخون درویزہؒ نے "ارشاد الطالبین" میں اس ترمذی خاندان کا شجرہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی پشتوں تک اس نامور خانوادہ

کے لوگ روحانیت کی دنیا میں انتہائی بلند مقام پر فائز رہے ہے، درویشی اور امارت اس گھرانے میں ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ دینی اور دنیوی وجاہت دونوں میں اُن کو حصّہ ملا۔ یہ لوگ زیبِ محراب و منبر بھی رہے۔ اور صاحبانِ شمشیر و عَلَم بھی۔ اِس سلسلے کے افرادِ ملک کی وزارت پر بھی فائز رہے اور مشہور مجاہد حضرت نجم الدین بڈہ ملّا صاحبؒ کے جانشین بھی۔

سیدعلی ترمذیؒ نے اسی عظیم المرتبت خانوادہ میں ۹۰۸ ہجری (۱۵۰۲ء) ولادت پائی۔ اُن کے والد ماجد کا نام حضرت سیّد قنبر علیؒ تھا جن کا مزار آج بھی خواجہ غلطان نامی مقام پر ہے جو قندز اور چار درّہ کے نواح میں مرجعِ خاص و عام ہے۔ تاریخ کی پُرانی کتابوں میں اس گاؤں کا نام "ترمذ" بیان ہُوا ہے۔

سید قنبر علیؒ کے بارے میں پیر بابا، سیدعلی ترمذی کا اپنا بیان ہے کہ "میرے والد بزرگوار سلاطینِ وقت کے مقربین میں شمار ہوتے تھے (سید عبدالجبار شاہ کے مطابق سید علی ترمذی سلطان ظہیرالدین بابر کے خواہر زادہ تھے) اُن کا رجحان درباداری اور امورِ مملکت کی طرف زیادہ تھا۔ وہ مغلیہ حکومت میں اہم منصب پر فائز تھے اور اُنہیں "امیرِ نظیر بہادر" کا خطاب دیا گیا تھا۔ البتہ میرے جدِ امجد (دادا) حضرت امام السلمین سیّد الدنیا والدین سید احمد نورؒ اپنے آبا و اجداد کے پسندیدہ طریقے پر سلسلہ کبرویہ کے سجادہ نشین تھے۔ اور اپنی دینداری اور پرہیز گاری کی بدولت سارے علاقہ میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

سید علی ترمذیؒ بچپن سے دنیوی اُمور سے بے نیاز تھے۔ اور ہر وقت کسی گہری سوچ میں پڑے رہتے تھے۔ کھیل کود اور ہنسی مذاق سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گھرانے کے لوگ پیار سے انہیں "دیوانہ" کہا کرتے تھے۔ تاہم چونکہ اُن کا رجحان زہد و ریاضت کی طرف تھا۔ اس لئے ان کے دادا سید احمد نورؒ ان پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے۔ جب گھرانے کا کوئی فرد سید علی ترمذی کو "دیوانہ" کہتا تو وہ فوراً اُسے ٹوک دیتے اور فرمایا کرتے تھے۔ "تم دنیادار اس دیوانے کی قدر و منزلت کیا جانو ــــ اس کی قدر و قیمت مجھ سے پُوچھو۔"

سید علی ترمذیؒ بھی شروع سے اپنے دادا جان سے مانوس تھے ــــ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم

بھی اُنہیں سے حاصل کی اور "شرح مُلا جامی" تک کی کتابیں اُنہیں سے پڑھیں۔ دادا اُن پر خصوصی توجہ مبذول فرماتے۔ خود سید علی ترمذی کا کہنا ہے کہ "میرے قلب میں ابتداً زہد و ریاضت کا چراغ میرے اہلِ نظر دادا جان کی توجہ سے روشن ہوا۔"

سلسلہ کبرویہ میں اجازت

پیر باباؒ مزید لکھتے ہیں کہ "جب میرے جد بزرگوار کی وفات کا وقت آیا تو اُنہوں نے مجھے بُلایا اور فرمایا میرے بیٹے! قرآن مجید میں سے جو کچھ تمہیں یاد ہو، پڑھو۔ میں نے سورۂ تبارک الذی کی تلاوت کی۔ فرمایا کہ پھر پڑھو۔ میں نے پھر وہی سورت پڑھی۔ فرمایا کہ پھر پڑھو۔ میں نے پھر وہی سورت پڑھی۔ پھر فرمایا کہ میرے بیٹے! وہ تمام برکتیں، نعمتیں اور سعادتیں جو مجھے حاصل تھیں اور ان میں سے بعض میں نے اپنے آباد اجداد سے حاصل کی تھیں وہ سب میں نے تم کو بخشیں۔"

پیر باباؒ فرمایا کرتے تھے کہ "فقیر کو سلسلۂ کبرویہ کا اِذن اسی عمر میں اپنے عظیم دادا جان کی زبان مبارک اور بیعت سے حاصل ہے۔"

دادا جان کی وفات کے بعد پیر باباؒ اپنے آپ کو یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتے تھے اُن پر وحشت کا عالم طاری رہتا۔ ہر وقت وہ گم سُم نظر آتے۔ دُنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں سے دل اُچاٹ رہتا۔ کھانے پینے اور کام کاج میں دل نہ لگتا۔ روحانی طور پر بھی بڑی بے کیفی کا سماں تھا۔ اور وظائف بھی یکسوئی اور دلجمعی سے ادا نہ ہوتے تھے۔

شاہی دربار میں

سید علی (پیر باباؒ) بیان کرتے ہیں کہ "والد صاحب ہر کوشش کرتے کہ میرا دل بہل جائے۔ کبھی کبھی وہ مجھے شاہانہ لباس پہنا کر اپنے ساتھ بارگاہِ سلطانی میں لے جاتے لیکن میرا یہ حال تھا کہ عمدہ لباس مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ جی چاہتا اسے نوچ کر پھینک دُوں۔ جونہی میں دربار سے واپس آتا فقیرانہ لباس پہن کر صوفیاء اتقیاء اور علماء کی مجلسوں میں بیٹھتا جس سے میری طبیعت میں بشاشت آتی کہ میرا طبعی رجحان اُسی طرف تھا۔

انہی دنوں سلطان ظہیر الدین بابر نے فتح ہندوستان کے ارادے سے لشکر کشی کا فیصلہ کیا۔ ہر

جنگ کے مجاہد اس کے پرچم تلے جمع ہونے لگے، بابر نے اپنے ولی عہد نصیر الدین ہمایوں کو ہمارے علاقے میں بھیجا کہ لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرے۔ میرے والد مجھے بھی اپنے ساتھ سلطانی لشکر میں لے گئے۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اللہ نے سلطان ظہیر الدین بابر کو کامیابی سے نوازا اور اس نے دہلی میں مستقل حکومت کی بنیاد رکھی ـــ جب میں نے سلطنت کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتے دیکھا تو دنیا کی ناپائیداری کا نقش دل پر مزید گہرا ہوگیا۔

پانی پت میں قلندرؒ کے حضور

حضرت پیر باباؒ کا کہنا ہے "ایک دن میں نے سپاہیانہ وردی میں پانی پت کے حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ اپنا اسلحہ اور سامان اپنے اردلی کے حوالے کر کے جونہی میں مزار پر مراقب ہوا، حضرت شیخؒ کے انوار و برکات کا نزول میرے دل پر ہونے لگا ـــ کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں نے ترکِ دنیا کی ٹھان لی اور مزار کے پچھلے دروازے سے نکل کر کسی نامعلوم ویرانے کو نکل گیا اور وہیں حق تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہوگیا ـــ میرے والد ماجد اور ساتھیوں نے مجھے بہتیرا ڈھونڈا لیکن میں مل نہ سکا آخر کار وہ سمجھ گئے کہ یہ دُنیا سے تو پہلے متنفر تھا، کہیں بھاگ گیا ہوگا

شیخ سیلونہ کی خدمت میں

والد کے دل کو چین کہاں تھا ـــ اُنہوں نے تلاش جاری رکھی اور آخر مجھے ڈھونڈھ نکالا ـــ میں اس وقت ایک ویرانے میں اللہ سے لو لگائے بیٹھا تھا ـــ والد کو دیکھتے ہی قدموں میں گر گیا اور ان سے اجازت مانگی کہ طلبِ حق کی راہ میں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے ـــ والد نے مجھے روکنے کی خاطر بہت سی نصیحتیں کیں لیکن میرا دل تھا کہ کوئی نصیحت قبول نہ کرتا تھا ـــ مایوس ہو کر والد نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ـــ پھر بھی باپ تھے از راہِ شفقت مجھے کچھ اشرفیاں دے کر فرمایا ـــ "یہ تمہارے سفر کا توشہ ہے!" میں نے رقم لینے سے انکار کیا اور عرض کی "اباجان! اسے رہنے ہی دیجئے، البتہ مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ جب میں طلبِ حق کے لئے جا رہا ہوں تو اپنی روزی بھی حق تعالیٰ ہی سے طلب کروں گا ـــ اگر مجھے روپے کی طلب اور چاہت ہوتی تو شاہی دربار سے کیوں بھاگتا۔"

حضرت پیر باباؒ کا کہنا ہے ــــ "جگہ جگہ پھرتا پھراتا میں مانک پور (نزد الہ آباد) پہنچا اور حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین جونپوری قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے مخدوم زمان، کہف الامان، ماحی بدعت، محی السنت و شریعت شیخ سیلونہ علیہ الرحمۃ والغفران کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا شوقِ طلب دیکھ کر وہ انتہائی شفقت سے پیش آئے اور میں اُن کی خدمت میں رہ کر علم دین حاصل کرنے لگا۔ یہاں تک کہ فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" تک میں نے اپنی تعلیم پہنچائی۔

پیر باباؒ شیخ سیلونہؒ کے علمی تبحر، غیر معمولی تقویٰ اور زہد و ریاضت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ "حضرت موصوف کاملین اولیاءاللہ سے تھے۔ سخت پابند شریعت و سنت تھے۔ اُن کی کرامات بیان سے باہر تھیں ــــ ایک بار انہوں نے وعظ کرتے ہوئے کہا۔ "صوفی وہ ہے جو فنافی اللہ تک پہنچ جائے اللہ تعالیٰ سے دل لگالے اور اُس کا حال یہ ہو کہ یادِ الٰہی سے کسی حال میں بھی غافل نہ ہو سکے۔" ــــ کسی کے سوال پر یا خود ہی تحدیث نعمت کے طور وہ یہ بھی کہہ گئے۔ "الحمدللہ! یہ کیفیت مجھے حاصل ہے" پیر باباؒ کہتے ہیں۔ "مجھے اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ انسان پر ایسی کیفیت بھی طاری ہو سکتی ہے۔" ایک دن بھری مجلس میں آپ وعظ و نصیحت کر رہے تھے، آپ کا ذہن اور زبان دونوں مصروف تھے ــــ میں نے سوچا۔ "کیا اس وقت بھی حضرت یادِ الٰہی میں مصروف ہیں؟ ــــ میں یوں بھی حضرت سے کافی فاصلے پر تھا، لیکن میرے دل میں خیال آتے ہی حضرت باتیں کرتے کرتے اچانک رُک گئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے ــــ" سید علی! میں اس وقت بھی ذکرِ الٰہی سے غافل نہیں ہوں"۔ یہ سن کر میں دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔

پیر باباؒ کہتے ہیں، میں نے کئی اور موقعوں پر بھی آزمایا ہے۔ حضرت (شیخ سیلونہؒ) ہمیشہ متوجہ الی اللہ ہوتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب حضرت شیخ سیلونہؒ کے پاس کافی عرصہ گذر گیا تو میں نے التجا کی "مجھے طریقت کے رموز سے بھی سرفراز فرمایا جائے۔" تب انہوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد فرمایا۔" یہ کام سرسری نہیں، اس میں دستگیر کی ضرورت ہوتی ہے ــــ یہ بھی متعین ہے کہ کس کو کہاں سے فیض ملے گا ــــ تم ہمارا سفارشی خط لے کر اجمیر شریف چلے جاؤ۔ وہاں ہمارے ایک پیر بھائی ولی کامل اس

منصب کے اہل ہیں۔ تمہیں وہاں سے فیض ملے گا۔"

شیخ سالار عطاء اللہ رومیؒ کے حضور

پیر باباؒ کہتے ہیں۔ "میں شیخ کا خط لے کر طویل مسافت طے کر کے شیخ الاسلام والمسلمین، سید الدنیا والدین شیخ سالار عطاء اللہ رومیؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے خط پڑھ کر میرا حال احوال پوچھنے کے بعد فرمایا "اے سید! یوں تو سادات صحیح النسب اور صحیح العقائد سب کے مخدوم ہوتے ہیں تاہم تمہارا مقصد خدمت سے حاصل ہوگا اور تمہیں پیر کامل کے حضور حاضر رہنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے مصلیٰ برداری کی خدمت سپرد فرما دی۔ میں نے پوری تندہی سے اس خدمت کو نبھایا، حضرت نے میرے جذبۂ خدمت کو دیکھ کر سلوک و تصوف کے سبق شروع کرائے۔ جو سبق مجھے ملتا میں ہفتوں اس کی مشق کرتا، جب اللہ کی مہربانی سے اُس کی حقیقت کو پہنچ جاتا تو حاضر ہو کر حضرتؒ کو حقیقت حال سے آگاہ کرتا جس پر وہ مسرور ہو کر اگلا سبق عطا فرماتے ــــ ایک طویل مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے مجھے انعاماتِ باطنی سے نوازا اور اپنا ماذون و مجاز مقرر فرمایا ــــ اب حضرت نے مجھے ارشاد و ہدایت کی اجازت تو دے دی لیکن مجھے تو شروع ہی سے طبعاً اختلاطِ خلقت سے کد تھی ــ میں زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کی عادت بنا چکا تھا۔ اس لئے حضرت سے عرض کیا کہ "میں ارشاد و تبلیغ کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا" ــ لیکن حضرت نے سمجھایا کہ دینے والا اعانت الٰہیہ کی نعمت یونہی عطا نہیں کرتا بلکہ یہ نعمت اُسی کو دیتا ہے جو اس کا اہل ہو" ــ اس پر تعمیلِ ارشاد کے بغیر چارہ نظر نہ آیا اور مرشد کے حکم کی بجا آوری شروع کر دی۔

حضرت پیر باباؒ بتاتے ہیں کہ ارشاد و تبلیغ کے راستے میں بہت سے موانعات ہیں، بعض اوقات شیخ کی شہرت اس میں کبرِ نفس پیدا کر دیتی ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو خدا رسیدہ اور کامل سمجھ بیٹھتا ہے جس سے اس کی مزید ترقی رک جاتی ہے ــــ اسی طرح اور آزمائشیں بھی ہیں اگر توفیق خداوندی سے بندہ اِن موانعات سے بچ کر ثابت قدمی کا ثبوت دے تو اللہ تعالیٰ کا ولی کہلانے کا حقدار بن سکتا ہے۔

پیر باباؒ نے سالک کے لئے ایسی رکاوٹوں کی تعداد ۱۲ بتائی ہے

اللہ نے مدد فرمائی اور پیر باباؒ خلقِ خدا سے ملنے جلنے لگے اور لوگ بھی بڑی تعداد میں اُن کی طرف رجوع کرنے لگے۔ انہی طالبانِ ہدایت میں ملک گدائی اور حاجی سیف اللہ گگیانی بھی تھے جو ہمایون کی فوج میں سردار تھے اور علاقۂ پشاور کے رہنے والے تھے۔ جب ہمایون کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست ہوئی تو یہ لوگ پریشان حالی میں اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔

کوہستان میں تعیناتی

اپنے مُرشد سے رخصت کی اجازت لینے سے پہلے پھر پیر باباؒ نے بتایا کہ "میں طبعاً تنہائی پسند ہوں اور ہجوم خلائق سے بھاگتا ہوں ــــ میں تو صرف اپنا تزکیۂ نفس چاہتا ہوں"۔ اس پر حضرت سالار رومیؒ نے انہیں ہدایت کی وہ کوہستان چلے جائیں اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائیں۔

مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں پیر باباؒ سید علی ترمذی عازم پشاور ہوئے۔ دورانِ سفر جب وہ گجرات پنجاب کے نواحی گاؤں داؤد پنڈ میں وارد ہوئے تو انہیں دیکھتے ہی ایک شخص نے جس کا نام کیلاس تھا۔ شور مچا دیا کہ " اے لوگو! دوڑو!! جس شخص کو میں نے خواب میں دیکھا تھا (اور وہ خواب تم سب کو سنا بھی چکا ہوں) وہ یہی شخص (پیر بابا) ہے ــــ اسے اپنا پیر و مرشد بناؤ ــــ ہماری نجات کا سامان اسی کے پاس ہے۔" دیکھتے دیکھتے لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ اس پر میں نے اُس شخص کے دعوے کی تردید کی اور اس کے دعوے کا ثبوت مانگا۔ اس پر سبھی لوگوں نے گواہی دی کہ اس شخص نے اس سلسلے میں جو خواب دیکھا تھا اور خواب میں جس حلیہ کے شخص کو دیکھا تھا۔ وہ آپ ہی ہیں۔

پیر باباؒ کہتے ہیں۔ " تب میں نے اُن سب لوگوں کو مرید شریعت بنا کر اُن سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بیعت لی ــــ کچھ عرصہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے مجھے اُسی جگہ ٹھہرنا پڑا اور لوگوں نے مجھے اپنا پیر یا پیشوا مان لیا۔

والد صاحب سے دوبارہ ملاقات

یہ وہ زمانہ تھا جب شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شہنشاہ

ہمایوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہمایوں خود سندھ اور بلوچستان کے راستے ایران چلا گیا تھا۔ جبکہ شکست خوردہ لشکر کے افغان اور سرحدی سپاہی اپنے اپنے وطن کی جانب رواں تھے۔ پیر باباؒ ابھی گجرات کے مقام داد و پنڈی ہی میں تھے کہ ان کی ملاقات اپنے والد ماجد سے ہوئی جو وطن واپس جارہے تھے۔ والد نے پیر باباؒ کو فرطِ محبت سے گلے لگایا اور کہا۔ ”ہم تو دنیا اور اس کے جھمیلوں ہی میں پھنسے رہے جہاں کبھی فتح ہے کبھی شکست۔ تم نے اچھا کیا کہ وہ راستہ اختیار کیا جو سیدھا اور حق کا راستہ ہے۔“ والد رخصت ہونے لگے تو انہوں نے اشرفیوں اور روپوں کے دو دو توڑے پیر باباؒ کو پیش کئے، پیر باباؒ نے یہ کہہ کر رقم واپس کردی کہ۔ ”یہ میرے کام آنے والی چیز نہیں۔“ تاہم اس خیال سے کہ والد کا دِل نہ دکھے۔ رقم اُن سے لے کر فقراء اور مساکین میں تقسیم کردی۔ اس کے بعد پیر باباؒ کے والد سید قنبر علی عازم وطن ہوگئے۔

جب پیر باباؒ کے والد ماجد اُن سے رخصت ہو کر اپنے وطن کو چل دیئے تو پیر باباؒ پر بڑی اداسی کی کیفیت چھاگئی۔ اپنے مرشد کے دیدار کی تمنا پھر جاگ پڑی اور وہ اجمیر شریف کی طرف چل پڑے۔ اب کے ان کا یہ ارادہ بھی تھا کہ اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے آپ کو خلق خدا کی تبلیغ وہدایت کی ذمہ داری سے آزاد کرالیں کیونکہ وہ یکہ تنہا یادِ الٰہی میں مصروف رہنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ اور ہجوم خلائق کو پسند نہ کرتے تھے۔ تاہم پیر باباؒ تو پیری مریدی کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اجمیر جارہے تھے۔ جبکہ تقدیر ان پر خنداں تھی کیونکہ جب وہ اجمیر پہنچے تو یہ سن کر دل تھام کر رہ گئے کہ حضرت سالار عطاء اللہ رومیؒ کا انتقال ہوچکا ہے۔ پھر جب شیخ سالار رومیؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ حسینؒ سے تعزیت کی خاطر ان کے گھر گئے تو انہیں مراقبے میں مصروف پایا۔ اُنہوں نے تھوڑی دیر بعد مراقبے سے سر اٹھایا، فاتحہ پڑھی اور پیر بابا سید علی ترمذیؒ سے یوں مخاطب ہوئے۔ ” اے سید علی! ابھی میں نے شاہدے میں والد بزرگوار (سالار رومیؒ) کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ میرے دو دو خرقے ہیں۔ ایک کو پھاڑ کر میرے عام مریدوں میں تقسیم کردو اور دوسرے کو اُس شخص کو پہنادو جو دور دراز سے سفر کرکے ابھی

ابھی تمہارے پاس پہنچے گا ۔ وہ شخص یقیناً صراط مستقیم پر ہے اور لوگوں کو رشد و ہدایت سے مشرف کر سکتا ہے ۔ چونکہ میں آپ میں وہ سب مطلوبہ علامتیں موجود پاتا ہوں جن کا ذکر والد صاحب (شیخ سالار رومیؒ) نے مجھ سے کیا ہے۔ لہٰذا میں اسے آپ کی نذر کرتا ہوں کیونکہ اس پر آپ کا نام بھی لکھا ہوا ہے ۔"

پیر بابا حضرت سید علی ترمذیؒ نے وہ خرقہ پہن لیا۔ وہ اجمیر گئے تو اس لئے تھے کہ رشد و ہدایت کی پابندیوں سے آزادی حاصل کر لیں گے لیکن خرقہ پہننے اور سالار عطا اللہ رومیؒ کے ماذون بن جانے کے بعد ان کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

پیر باباؒ کچھ عرصہ تک حضرت شیخ حسینؒ کے پاس اجمیر میں ٹھہرے ۔اس دوران انہوں نے ان کی تواضع اور مہمانداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بالآخر جب حضرت پیر باباؒ نے اپنے مرشد زادہ سے رخصت کی اجازت چاہی تو حضرت شیخ نے انہیں تاکیداً کہا:" والد محترم نے فرمایا تھا کہ جب آپ آئیں تو میں آپ کو ان کا پیغام پہنچا دوں کہ آپ کوھستان چلے جائیں جہاں تبلیغ اسلام کی اشد ضرورت ہے ۔ "

ورودِ پشاور

اجمیر سے روانہ ہو کر جگہ جگہ ٹھہرتے جب پشاور پہنچے جہاں ان کے مخلص مریدوں حاجی سیف اللہ گگیانی اور ملک کدائی کو ان کے آنے کی خبر ملی، وہ بڑی منت سماجت سے پیر باباؒ کو اپنے ہاں دوآبہ لے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی علاقہ بھر کے عوام ان کی زیارت کے لئے آئے اور بعض نے ان سے بیعت طریقت کر لی اور بعض نے بیعت شریعت ۔ ایک سال تک حضرت پیر باباؒ کا قیام دوآبہ میں رہا ۔ ایک سال کے بعد جب پیر باباؒ نے اپنے وطن قندز جانا چاہا تو سارے علاقے کے لوگ جرگہ لے کر آئے اور عرض کی کہ

"آپ کی تشریف آوری سے اس علاقے کے ہزاروں مسلمانوں نے تو بہت فیض پایا ہے۔ تاہم نواحی علاقہ یوسف زئی میں بھی آپ کے تشریف لے جانے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ وہاں ملحد اور جھوٹے مدعیان ولایت کا بڑا زور ہے۔ اور وہ اپنی دنیوی

اغراض کی خاطر لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کذاب لوگوں سے عوام کو نجات دلانا ضروری ہے۔"

سرزمین یوسف زئی میں آمد

حضرت پیر بابا اپنی اسلامی اور تبلیغی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے یوسفزئی کے علاقے میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کے عوام نہایت سادہ دل اور اسلام کے شیدائی ہیں، وہ اللہ اور رسول کے نام پر سر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کے جوان بوڑھوں سے بھی بڑھ کر دیندار ہیں اور عورتیں دینی امور کی مردوں سے بھی زیادہ پابند ہیں، یہاں تک کہ بچے بھی اسلام سے محبت کرتے والے ہیں۔ مگر ایک تو دینی تعلیم کے فقدان کے باعث اور دوسرے علماء حق کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ خود غرض اور جعلی پیروں کے جال میں پھنس چکے ہیں ـــ پیر بابا نے ان بدعقیدہ "پیروں" کے پھیلائے ہوئے غلط خیالات کا سدباب کیا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

سدوم میں قیام اور ازدواج

حضرت پیر بابا نے کچھ عرصہ سرزمین یوسف زئی کے مشہور قصبہ سدوم میں قیام فرمایا۔ لوگ جوق در جوق ان کی خدمت میں آتے اور فیض پاتے رہے۔ ان لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جن سے ان کو عقیدت ہو، اپنے وطن میں مستقلاً ٹھہرانے کے لئے یہ تدبیر کرتے کہ کسی سرکردہ قبیلہ کا سردار یا خان اپنی بیٹی یا بہن کا عقد اس سے کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اہل بونیر کے ایک نامور سردار ملک دولت خان ملیزئی (بارک شاہ زئی) نے اپنی ہمشیرہ بی بی مریم پیر بابا کے عقد میں دے دی۔ اگرچہ پیر بابا اس سلسلے میں پہلے انکار کرتے رہے۔ لیکن ہزاروں عوام کا اصرار ان کے انکار پر غالب رہا ـــ اللہ تعالیٰ نے اس نیک بخت خاتون سے آپ کو اولاد عطا کی۔ اور اس طرح پیر بابا نے مستقلاً کوہستان یوسف زئی کو اپنا وطن بنالیا۔

والدہ محترمہ سے ملاقات

کچھ عرصہ بعد حضرت پیر بابا کے دل میں اپنے وطن عزیز کو دیکھنے اور والدین سے ملاقات کرنے کی تمنا نے انگڑائی لی ـــ چنانچہ انہوں

نے اپنے اہل خانہ کو تو سدوم ہی میں رہنے دیا اور خود اُن سے اجازت لے قندز پہنچے۔ وہاں پہنچنے پر آپ کو پتہ چلا کہ آپ کے والد محترم اِس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں البتہ والدہ کے دیدار سے فرحت پائی۔ والدہ ماجدہ کو جب معلوم ہوا کہ سید علی غواص (پیر باباؒ) سدوم میں شادی کر چکے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ کر اُن سے ملاقات کو آئے ہیں تو انہیں اجازت دی بلکہ ہدایت کی کہ وہ واپس سدوم جائیں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

پاچا کلی میں آمد

سدوم سے نقل مکانی کر کے حضرت پیر باباؒ نے بالآخر بونیر کے مقام پاچا کلی کو اپنا مستقل مستقر بنایا۔ وہ اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ اور ان کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے۔ یہ مقام ایک پہاڑی ندی کے کنارے بڑے پُر فضا ماحول میں پہاڑوں کے گود میں واقع ہے۔ مزار پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک وسیع جامع مسجد بھی ہے جو جدید فن تحریر کا شاہکار ہے۔ مزار سے تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی غار ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت پیر باباؒ وہاں مراقبہ فرماتے اور چلّے کاٹتے تھے۔

حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) علیہ الرحمتہ نے سال ۹۹۱ ھجری (۱۵۸۳ء) میں اِس دنیائے فانی سے دارِ آخرت کو سفر فرمایا۔ اُن کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔ صوبہ سرحد، قبائلی علاقوں، افغانستان اور شمالی پنجاب سے ہر روز ہزاروں لوگ حضرت پیر باباؒ کے ہاں حاضری دیتے، رات بھر ملحقہ مسجد میں نفل ادا کرتے، مراقب ہوتے اور دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں۔ سالانہ عرس پر تو زائرین کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔

مزار پر لنگر کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ایک دینی مدرسہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ جہاں دُور نزدیک کے طلباء آتے اور دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

حضرت سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کی وفات کے بعد شاہانِ وقت نے ایک بڑی ریاست کونڑ کے علاوہ تختہ بند (بونیر) کے صاحب سجادہ و دستار کے لئے چوبیس ہزار روپیہ سالانہ کا عطیہ دائمی بھی منظور کیا تھا۔

حضرت پیر باباؒ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد شہنشاہ اکبر نے یوسف زئی کے خلاف فوجی مہم بھیجی۔ پہلی بار درہ کڑاکر میں مغل فوجوں کو سخت رسوائی کا سامنا ہوا تاہم دوبارہ مغلوں نے میدانی علاقوں کی تاخت و تاراج شروع کی تو لوگوں نے جان لیا کہ حضرت پیر باباؒ جیسی ہستی کے اُٹھ جانے کے بعد اب ان کی آزمائشوں کا دور شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں نے بایزید انصاری کے ساتھ خونین معرکوں اور خانہ جنگی کو بھی عذاب سے تعبیر کیا ہے۔

پیر باباؒ سید علی ترمذی علیہ الرحمتہ کی رحلت کے بعد اُن کے جانشینوں، اولاد اور ارادت مندوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور سارے کوہستانی علاقوں، کاغان، کشمیر، گلگت، پکھلی کافرستان اور چترال کے لوگ ان کی تبلیغی مساعی کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

باب ۳

افکار و نظریات

حضرت سید علی ترمذی المعروف پیر باباؒ خود ایک عالم با عمل تھے۔ اس لئے دوسروں کو بھی علم و عمل کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں باطنی استعداد کے ساتھ ساتھ نفسِ انسانی کا گہرا شعور بھی عطا فرمایا تھا ـــــ وہ انسانی فطرت اور نفسیات سے کماحقہٗ آگاہی رکھتے تھے اس لئے ایک مشفق اور ماہر معلّم کی طرح شاگردوں اور مریدوں کو اُن کے حسبِ حال تعلیم دیا کرتے تھے، چونکہ وہ ایک صوفیِ کامل تھے اس لئے ظاہری پندارِ علم کا سایہ تک اُن پر پڑنے نہ پایا تھا۔ اُن کا طریق طریقِ محبت تھا۔ اُن کے دروازے سبھی پر کھلے تھے ـــــ جو کوئی چاہتا بے جھجک اُن کے پاس حاضر ہوتا۔ اپنے مسائل اور اپنی مشکلات بیان کرتا۔ وہ اُسے حل کرتے، کوئی علمی نکتہ اٹھاتا تو اُسے بڑی ملائمت اور نرمی سے اس کے بارے میں بتاتے۔ اُن کی نظر آفاقی اور وسیع تھی۔ اس لئے وہ گروہی اور اختلافی امور سے بالاتر رہتے اور ہر آنے والے سے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتے۔ ہر دُکھیا کے زخم پر مرہم رکھتے۔ ہر انسان سے ہمدردانہ طور پر پیش آتے ـــ زاہدانِ تنگ نظر کے برعکس صوفیائے کرام ہر کسی کو گلے لگاتے ہیں، وہ گناہ سے نفرت کرتے ہیں لیکن گناہ گار کو دھتکارنے والے نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصد ہر انسان کی راہنمائی اور اصلاح ہوتا ہے۔ وہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والے ہوتے ہیں۔ بقول کسے

ع دلِ شکستہ در آں کوچہ می کنند درست ٭ چناں کہ خود نشناسد کہ از کجا بشکست

اُن کے نزدیک طریقت اور شریعت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہوتے ہیں، البتہ وہ پہلے

دلوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ دل خلوص آشنا ہو جائے تو اعمال ظاہری میں سوز و گداز اور حسن نیت کا پیدا ہونا ضروری ہے، دل اللہ پاک کی یاد سے معمور ہو جائے تو انسان کا کوئی فعل اللہ کی رضا کے خلاف سرزد ہونے نہیں پاتا۔

پیر باباؒ جیسے عالم فاضل کے بارے میں بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ضرور صاحب تصنیف و تالیف ہوں گے، تاہم اُن کے جانشینوں کو اتنی آزمائشوں، آویزشوں اور انقلابوں سے واسطہ پڑا کہ اُن کی تحریریں محفوظ رہنے نہ پائیں۔ صرف وہی اقوال و احوال ہم تک پہنچے جن کا ذکر اُن کے نامور جانشین علامہ اخون درویزہ باباؒ نے اپنے عظیم مرشد کے بارے میں اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ پیر بابا علیہ الرحمۃ کے ان افکار و فرمودات سے اُن کی حیات و تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے اور ہر سمجھدار اور غیر جانبدار قاری اُس رفعتِ مقام کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ جس پر پیر باباؒ فائز تھے — یہ امر بھی دوستوں کے دلوں کو ٹھنڈک بخشنے اور مخالفوں کی آنکھیں کھولنے کا موجب ہے کہ پیر باباؒ کا نام اور مشن ابھی تک زندہ ہے، اُن کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اور وہ آج بھی اُن کے فرمودات سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

ہم پیر باباؒ کے چیدہ چیدہ اقوال کو قارئین کے افادہ کے لئے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

پیر طریقت کیسا ہو؟ "لازم ہے کہ پیر طریقت وہ ہو جو جملہ احوال و اقوال میں سید المرسلین، رحمت للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے طریق اور سنت سے ذرا بھر تجاوز نہ کرے اور جزوی اور کلی امور میں اتباع نبویؐ کو اپنا شعار بنائے۔"

خرقِ عادات یا کشف وغیرہ کمال نہیں ہے "کشف اس کو کہتے ہیں کہ عام لوگ جس چیز کو نہیں دیکھ سکتے اہل اللہ کو اپنے باطن کی صفائی کی بدولت دل کی آنکھوں سے نظر آجاتی ہے — تاہم کشف و کرامت کسی ولی سے ظہور میں آتے ہیں کسی سے نہیں، اس لئے کشف و کرامت کو

معیارِ ولایت نہیں سمجھنا چاہیئے ــــ"

درویشی کا حاصل

"علمائے حقانی، ہادیانِ قوم اور اولیائے کرام کو بڑا متحمل ہونا چاہیئے نہ وہ کسی سے انتقام لیں نہ مخالف عقیدہ رکھنے والوں پر غیض و غضب کا اظہار کریں ــــ اُن کا کام خلقِ خدا کی ہدایت ہے، جہاں تک ہو سکے لوگوں کی ہدایت کریں۔"

مرید کا فرض

"مرید کو چاہیئے کہ بغیر ذکرِ الٰہی یا عبادتِ خدا کے کسی دوسری بات کی طرف التفات نہ کرے اور نہ عام لوگوں کی باتوں کی پرواہ کرے ــــ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اُمّتِ محمدیہؐ میں ایسے ایسے مردانِ خدا گذرے ہیں اور موجود ہیں کہ اُنہوں نے بڑے درجات و مراتب حاصل کئے ہیں مگر ذرہ بھر بھی کشف و کرامات اور اسرارِ الٰہی ظاہر نہ ہونے دیے ــــ اور یہ خیال تک نہ کیا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ ــــ درویشی کی غایت یہی ہے کہ عبادت، ریاضت، زہد و تقویٰ اور حسنِ اخلاق کو اپنا وظیفۂ حیات سمجھا جائے ــ"

سمجھانے کا طریقہ

حضرت پیر باباؒ ہر ایک سے نرمی اور ملائمت سے پیش آتے۔ کسی کو سختی سے نہ ڈانٹتے بلکہ ایسے انداز میں اُسے سمجھاتے کہ وہ خود ہی اپنے خراب عقیدوں اور عادتوں سے باز آجائے۔

اس سلسلے میں اخون درویزہؒ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک بار حضرت پیر باباؒ اور میں ایک ایسے امیر شخص کے گھر مہمان ہوئے جو بھنگ پیتا تھا اور عقیدہ تناسخ اور آواگون کا قائل تھا۔ اُس کا باپ بھی اسی قسم کے عقائد رکھتا تھا۔ اور ترنگ میں آکر کبھی اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) علی المرتضیٰ کہتا تھا اور کبھی خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ مرتے وقت اُس نے بیٹے کو وصیت کی کہ میری موت کے دس بارہ سال بعد تم بادشاہ دہلی کے دربار میں آنا۔ وہاں میں شہزادے کے طور نیا جنم لوں گا۔ اُس وقت میں دس بارہ سال کا ہو چکا ہوں گا۔ تم آؤ گے تو تمہیں پہچان

ہوں گا۔ اور تم پر شاہانہ نوازشیں کروں گا۔ اُس شخص کو اپنے باپ کی اس "وصیت" پر اتنا یقین تھا کہ اُس نے بادشاہ کو تحفہ پیش کرنے کے لئے دو عمدہ گھوڑے بھی خرید رکھے تھے۔ اور دہلی جانے کی تیاریاں کر چکا تھا۔

ہم سب لوگوں کو اُس بدعقیدہ شخص کی باتوں پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن حضرت پیر بابا بڑے تحمل سے اُس کی باتیں سُنتے رہے۔ اور جب وہ اپنی باتیں پُوری کر چکا تو اسے تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کی نصیحت پر ضرور عمل کرے۔ اور ضرور دہلی جاکر بادشاہ سے ملاقات کرے۔

اخون درویزہ کہتے ہیں کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہو کر دوسری جگہ گئے تو پیر بابا صاحب سے بڑے تعجب سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا ہے۔ اُس بدعقیدہ شخص کو منع کرنے کی بجائے آپ نے اُسے تاکید کی ہے۔ کہ باپ کی وصیت کے مطابق ضرور دہلی جاؤ اور بادشاہ سے ملاقات کرو۔ آخر آپ نے یہ کیوں کہا۔ ؟"

حضرت پیر بابا نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مسلسل کئی سالوں تک اپنے باپ سے یہ غلط باتیں سنتا آیا ہے۔ اب یہ باطل عقیدہ اُس کے دماغ پر نقش ہو چکا ہے۔ اگر ہم صرف نصیحت سے اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے تو چنداں کامیابی نہ ہوتی ۔ جب یہ شخص قیمتی گھوڑے اور دوسرے تحائف لے کر اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد دہلی پہنچے گا تو اوّل تو بادشاہ کا کوئی بیٹا ہی دس بارہ سال کی عمر کا نہ ہوگا اور اگر ہُوا بھی تو وہ اُسے کب پہچانے گا اور اسکی کیا خاطر مدارات کرے گا۔ بلکہ اُلٹا اسے پاگل سمجھ کر اور بے عزت کر کے دربار سے نکال دے گا۔ اس طرح اسے جو رسوائی اور مایوسی ہوگی اُس سے نہ صرف اُس کی آنکھیں کھُل جائیں گی بلکہ جو بھی یہ واقعہ سُنے گا تناسخ اور آواگون کے باطل عقیدے کا مذاق اُڑائے گا۔

غفلت کی سزا

اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت پیر بابا مسجد سے نکل کر گھر جا رہے تھے، ان کے فرزند سید مصطفیٰ بھی جانماز کندھے پہ ڈالے اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔ جب وہ ایک تنگ کوچہ میں پہنچے تو سامنے سے دو

طاقتور بیل نمودار ہوئے اور آپس میں لڑنے لگے، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے وہ حضرت صاحبؒ پر آگرے جس سے اُن کا چہرہ لہولہان ہوگیا اور کچھ دوسری چوٹیں بھی لگیں ۔ گھر پہنچے تو بیٹے سے کہا ۔ "آج مجھے پہلے ہی سے کسی آفت کے نازل ہونے کا ڈر تھا" ۔ بیٹے نے پوچھا "وہ کیسے؟" حضرتؒ نے کہا "وہ یوں کہ آج رات میں بیدار نہ ہوسکا اور نمازِ تہجد فوت ہوگئی جس پر مجھے سزا کا ملنا لازم تھا۔"

خدائی امانت

اخون درویزہؒ کا کہنا ہے کہ ایک بار میرے اُستاد حاجی محمد صاحب المعروف بہ مُلازنگی پاپینی نے شیخ معظم (حضرت پیر باباؒ) کے حضور میری بہت سفارش کی اور کہا کہ یہ (اخون درویزہ) فلاں باطنی شغل اور تلقین طریقت کا شوق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کا اہل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر نگہِ کرم کی جائے۔" لیکن حضرت مخدوم (پیر باباؒ) کی عادت تھی کہ اس بارے میں حد سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ "یہ خدائی امانت ہے اہل کے بغیر کسی اور کو اس کا سپرد کرنا خیانت کاری ہے۔ البتہ اس خدائی امانت کے اہل علماء اور اتقیاءؒ ہیں نہ کہ جاہل اور ناسمجھ لوگ۔" اخون درویزہؒ کا کہنا ہے کہ بفضل تعالیٰ مجھے حضرت پیر باباؒ نے اُس باطنی شغل کی اجازت مرحمت فرمادی۔"

عارفِ کامل کی پہچان

حضرت پیر باباؒ نے اخون درویزہ باباؒ کو تاکید فرمائی کہ علمِ تصوف (موافقِ شریعت) کے حصول میں پوری پوری کوشش کرو۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے عارفِ کامل بن جاؤ۔ اپنا ایمان بھی سلامت لے جاؤ اور مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بھی ہلاکت و زوال سے بچاسکو۔" حضرت پیر باباؒ نے افسوس ظاہر کیا کہ کئی لوگ محض علمِ تصوف کی چند اصطلاحات سیکھ کر اسے بطور پیشہ اختیار کرلیتے ہیں ۔ وہ بھلا دوسروں کی کیا رہنمائی کرسکتے ہیں۔"

کمال تربیت

اخون درویزہ علیہ الرحمۃ بتاتے ہیں کہ ہمارے حضرت کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؒ طالبِ صادق کے ساتھ اُس کی توقع سے بھی بڑھ کر شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اور اُس کو مقاماتِ عالیہ تک پہنچانے کی ہر ممکن سعی کرتے تھے۔

یہانتک کہ وہ شخص درجۂ کمال کو پہنچ جاتا تھا ۔ پھر اُسے رخصت کرکے اُس کے علاقہ میں بھیج دیتے تو وہ سب اہلِ وطن کے لئے ایک نمونۂ عمل ثابت ہوتا ۔ حضرتؒ سے تربیت یافتہ انہی لوگوں کی وجہ سے ان سارے علاقوں میں اسلام کی روشنی پھیلتی گئی۔

اِتباعِ سنت

اخون درویزہ مزید لکھتے ہیں کہ میں کئی برس تک رات دن، سفر وحضر میں حضرت پیر باباؒ کی خدمت میں حاضر رہا۔ میں نے ان کی ہر حرکت، ہر عمل اور ہر ادا کو سنتِ نبویؐ کے عین مطابق پایا۔ اور ان کے ہر کام میں (جو سنت کے موافق ہوتا) برکات اور انوار کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ حضرتؒ سے ماذون و مجاز ہونے کے بعد میں نے بھی اسی طریق کو اپنایا۔

رضائے الٰہی

لکھتے ہیں ۔۔ سالک کو فنِ تصوف میں تمام کوششیں محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کرنی لازم ہیں ۔ کشف وکرامت کا شوق اور آرزو رکھنا ضروری نہیں ۔ عوارف المعارف میں ہے کہ اگر تصوف کے طالب کی نیت ابتدا ہی سے کشف وکرامت کے حصول کی ہو اور وہ خالصتاً رضائے الٰہی کا جویا نہ ہو تو شیطان اُسے سیدھے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

ے بکن بیرون زِ دل ہر ماسوا را ۞ بیابی آں زمان سترِ خدا را

خلوص نیت

اخون درویزہ باباؒ کا کہنا ہے کہ ایک بار میں طویل عرصہ کے بعد حضرت پیر باباؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا۔۔ "اتنا عرصہ کہاں غائب رہے ؟" میں نے عرض کی "کچھ عرصے سے تنگ دست ہوں. خالی ہاتھ آپ کے پاس آتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ نہ آسکا۔" فرمایا "کتنے عجیب آدمی ہو! اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کو نہیں دیکھتا، خلوص نیت کو دیکھتا ہے۔ میں تو صرف اُنہی لوگوں کو مخلص مُرید سمجھتا ہوں جو مجھ سے رُوحانی فیض حاصل کرنے میرے پاس آتے ہیں۔ جو میرے پاس گائے، بیل، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ میں اُن کے تحائف خدا کی طرف سے

سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ میرے خاص دوست اور مُرید نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا کی طرف سے مجھے چیزیں پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں۔"

نصیحت قبول کرنا

"اخبار الاولیاء" میں ہے کہ شیخ علی ترمذی (پیر باباؒ) جو سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے منسلک تھے سلسلۂ چشتیہ کے رواج کے مطابق سماع سنتے تھے۔ حضرت اخون درویزہؒ نے اس پر اپنے مُرشد کو اس کے خلافِ سُنت ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ اُن کے شیخ (پیر باباؒ) نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا "بات یہ ہے، میں کبھی کبھی سماع اس لئے سُنتا ہوں کہ سماع کی حالت میں بعض اسرار مجھ پر منکشف ہوتے ہیں۔ تاہم میں اسے ترک کرنے پر تیار ہوں۔ اُس کے بعد اُنہوں نے کبھی سماع نہیں سُنا۔

طریقۂ تعلیم

اخون درویزہ باباؒ بیان کرتے ہیں کہ "میں اپنے شیخ (حضرت پیر باباؒ) سے اس طرح تعلیم حاصل کرتا تھا کہ ایک ہفتے تک خلوت اختیار کرکے اُس پر غور و فکر کرتا اور بے پناہ ریاضت کے بعد جو کچھ میں محسوس کرتا اُسے اپنے شیخ کے سامنے پیش کرتا۔ شیخ مجھے مبارک باد دیتے اور میری تقریروں کو پسند کرتے، پھر دوسرا سبق دیتے۔ اس طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ یہاں تک کہ شیخ نے مجھے رخصت کی اجازت دی۔

ظالم بادشاہ علامت عذاب ہے

اکبر بادشاہ کے نام نہاد مذہب "دینِ الٰہی" اور اس کے سوات اور بونیر پر حملے کے بارے میں پیر باباؒ کا محاکمہ ہے کہ "لوگ اکبر بادشاہ کے قہر و غضب میں اس لئے گرفتار ہوئے کہ حدیث میں رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جس ملک میں گمراہیاں عام ہوتی ہیں اس ملک کو اللہ تعالیٰ ظالم بادشاہ کے عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔"

خلوت نشینی

تذکرۂ سلطان الاولیاء میں پیر بابا سیّد علی ترمذیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خلوت پسند تھے اور گوشہ نشینی کو پسند

کرتے تھے۔ نیز کم گوئی کے عادی تھے

صوفی کے امتحان اور آزمائشیں

اخون درویزہ باباؒ نے "تذکرۃ الابرار والاشرار" میں وضاحت کرتے ہیں کہ مرشدنا حضرت پیر باباؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سالک اور صوفی کو سلسلۂ درویشی میں بہت سی آزمائشوں اور امتحانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

اول یہ کہ صوفی کی شہرت عوام و خواص میں پھیل جاتی ہے، بڑے بڑے سربرآوردہ لوگ بھی اُس سے ملاقات کی آرزو کرتے ہیں۔ اگر صوفی اس ظاہری عزت پر خوش ہوا اور شہرت پسند بن کر رہ گیا تو قرب الٰہی سے محروم رہ گیا۔ اگر شہرت پر خوش نہ ہوا اور لوگوں سے کنارہ کش رہا تو لوگ اُسے مغرور و متکبر سمجھنے لگ گئے۔

دوم۔ صوفی کو چاہیئے کہ کشف و کرامات کو اپنا مقصود نہ جانے اور ان کے ظہور پذیر ہونے پر خوش نہ ہو کیونکہ مقصود اصلی تو رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ جو کوئی اللہ کی رضا کے سوا کسی بات کو خاطر میں نہ لائے گا، دین دُنیا میں عزت اور نام پائے گا۔

بیعت طریقت و شریعت

حضرت پیر باباؒ مریدانِ طریقت بنانے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مگر بیعت اتباع شریعت تمام لوگوں سے لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ مریدان شریعت کہا کرتے تھے۔ ان کے استعداد باطنی کا یہ حال تھا کہ ان کی صحبت میں رہ کر جاہل سے جاہل اور بدعمل لوگ بھی متقی اور پرہیزگار بن جایا کرتے تھے۔

فیض کے سرچشمے

اخون درویزہؒ نے اپنی کتاب "ارشاد الطالبین" میں لکھا ہے کہ شیخ المشائخ سیادت پناہ سید علی ترمذی علیہ الرحمتہ چودہ[۱۴] سلسلوں کے خانوادوں کے مجاز اور ماذون تھے۔

سماع و رقص

اخون درویزہ باباؒ صوفیاء اور بزرگانِ اہل حق کے سماع اور

رقص کے متعلق کمال احتیاط اور حدِ شریعت کے اندر رہنے کی پابندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے مرشدِ گرامی سید علی ترمذی قدس سرہٗ سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ ایک دن حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے بغیر حالتِ وجد گفتگو کے ہاتھ اُوپر اٹھایا جس سے دیکھنے والے کی نظر میں وجدانی کیفیت کا اظہار مطلوب تھا۔ اُس سال بخارا کے سارے علاقہ پر طرح طرح کی بیماریاں اور بلائیں نازل ہوئیں جن سے بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ آخر شہر کے معززین اور عمائدین اکٹھے ہو کر شیخؒ کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ بارگاہِ الٰہی میں دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان آفتوں سے نجات دے۔ حضرت شیخؒ نے رات کے وقت چھت پر وضو کے بعد دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی۔ خدایا مخلوق سے ان بلاؤں کو اٹھا لے۔ تو آپکو ہاتف نے آواز دی کہ بلائیں تو آپ کے صحو، بغیر وجد ہاتھ اٹھانے کی سزا میں ملک پر نازل ہوئی ہیں۔ اس پر شیخ نے التجا کی کہ الٰہی! بدعت تو مجھ سے سرزد ہوئی۔ لوگوں کا کیا گناہ؟ سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیئے۔ ناگاہ آپ چھت سے اترتے وقت سیڑھی سے گر گئے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگ عیادت کے لئے آئے اور کہنے لگے ہم تو آپ کو وسیلہ بنا کر دفعِ بلا چاہتے تھے آپ خود ابتلاء میں آگئے! فرمایا "گناہ اصل میں میرا ہی تھا لیکن تم پر بھی ابتلاء آگئی۔" اُسی وقت سے شہر بخارا اور نواحی علاقوں سے امراض اور آفات کا خاتمہ ہو گیا۔

رازداری

اخون صاحبؒ کا کہنا ہے ایک دن میں حضرت مخدومی سید علی ترمذی علیہ الرحمۃ کے ساتھ ایک بیابان میں سفر کر رہا تھا۔ جب تصوف کے بعض دقیق نکات کا ذکر آیا تو حضرت نے اپنا منہ میرے کان سے لگا کر نہایت رازدارانہ طریق پر وہ نکتہ مجھے سمجھایا حالانکہ ہم دونوں کے علاوہ اُس ویرانے میں کوئی نہ تھا۔ لیکن چونکہ سابقہ بزرگانِ دین نے اس سلسلے میں رازداری سے کام لینے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ اسلئے حضرت پیر باباؒ نے اُس پر عمل کیا۔

شرطِ اوّل

حضرت پیر باباؒ کہتے ہیں: مبتدی کے لئے اوّل زینہ کردار و گفتارِ مصطفویؐ پر مکمل کاربند ہونا ہے کہ اس سے سرِ مُو تجاوز بھی جائز نہیں۔

استعدادِ باطنی

اخون درویزہ نے کہا ہے کہ "شیوخ حقّانی مرید کی باطنی استعداد سے بخوبی باخبر ہوتے ہیں، وہ مرید کی باطنی استعداد کے مطابق ہی اسی کو اوراد و نوافل کی تلقین اس شخص کے حسبِ حال کرتے ہیں تاکہ وہ کسی زعم باطل یا شیطانی وسوسے میں گرفتار نہ ہو جائے۔

خدائی امانت

حضرت پیر باباؒ کی عادت تھی کہ مرید بناتے وقت حد سے زیادہ احتیاط برتتے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ خدائی امانت ہے اور امانت اُسی کو سپرد کرنی چاہیئے جو اس کا اہل ہو۔

طالبانِ حق پر خصوصی شفقت

اخون درویزہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ملّا عباسی ایک غریب الدیار شخص کو لے کر مخدوم الانام سیّد علی ترمذی (پیر باباؒ) کے پاس آئے اور پُرزور سفارش کی کہ یہ شخص رموزِ طریقت پانے کا متمنّی ہے اور جگہ جگہ اس کی تلاش میں پھر رہا ہے۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ ھرات کا رہنے والا ہے اور تلاشِ مرشد میں سرگردان ہے مگر بہت سے نامور علماء و مشائخ سے ملنے کے باوجود اب تک گوہرِ مقصود حاصل نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ خراسان، شمالی ہند، کشمیر اور لداخ کی خاک چھان چکا ہے، اب سرزمین یوسف زئی میں وارد ہوا ہے۔ چشم عنایت کا طالب ہے۔ حضرت نے اُسے اپنے ہاں ٹھہرایا اور اس پر توجہ دی۔ بالآخر وہ شخص علوم ظاہری و باطنی میں اوجِ کمال تک پہنچ گیا جب وہ تمام مراحل طے کر چکا تو اسے اجازت دی کہ وطن واپس جائے اور لوگوں کو فیض یاب کرے۔ اخون صاحب کا کہنا ہے کہ "ہمارے حضرت طالبِ صادق کے ساتھ حد سے زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ اور اسے مقاماتِ عالی تک پہنچانے کی ہر ممکن سعی کیا کرتے تھے۔

اصلاحِ عقائد

اخوند درویزہؒ کے مطابق حضرت پیر باباؒ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں میں سارے فتنہ و فساد بے علم "پیروں" اور نام نہاد علماء سوء کا پیدا کیا ہوا ہے۔ حضرت جہاں بھی جاتے وہاں کے علماء کے عقائد کی جانچ پڑتال کرتے۔ ہر عالم سے علیحدگی میں ملتے۔ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے اور اگر پھر بھی وہ خلافِ شریعت روش پر قائم رہتا تو لوگوں کو اس کے فساد سے آگاہ کرتے اور اعلانیہ اس کی مخالفت کرتے۔

اسلامی حکومت کی ضرورت

حضرت پیر باباؒ نے جو دور پایا، وہ دین سے بے نیازی کا دور تھا۔ مغلوں کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت تو کہا جا سکتا ہے لیکن اسلامی حکومت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اکبر کے عہد حکومت میں آزاد خیالی اور الحاد کا زیادہ دور دورہ تھا، بالخصوص سرحدی علاقوں میں کوئی اسلامی حکومت نہ تھی۔ پیر باباؒ کہا کرتے تھے کہ توضیح اور اشاعت اسلام علماء کا کام ہے لیکن تقویت و اجرائے شریعت اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اخون درویزہ کہتے ہیں تاہم سرزمین یوسف زئی میں حضرت پیر باباؒ کا وجود بہت غنیمت تھا۔ وہ نہ ہوتے تو نہ جانے یہاں کے لوگ دین سے کتنے بے بہرہ رہ جاتے۔

دوستی یا دشمنی کا معیار

اگرچہ بایزید انصاری کے عقائد و نظریات کی پیر بابا علیہ الرحمۃ نے پوری مخالفت اور تردید کی تاہم وہ اکثر کہا کرتے تھے "اے لوگو! میرا اس کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ اگر یہ اپنے عقائد کو درست سمجھتا ہے تو میں اسے کہتا ہوں، میرے سامنے آئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو ولایت عطا کی ہو تو ایسے موقع پر وہ کرامت دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں اس کے عقائد کی تردید میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ دعا کروں گا۔ وہ بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اگر اس کے ہاتھ کٹ کر زمین پر گر پڑیں تو تو وہ اپنے عقائد باطلہ سے توبہ کرلے اگر ایسا نہ ہوا اور میری دعا نا مقبول ہوئی تو میں اپنے آپ کو شرمسار سمجھوں گا

۔ اگر بایزید کو اپنی کرامت نمائی پر یقین ہو تو آئے اور یہ بات آزما کر دیکھ لے ۔۔
مجھے تو اس سے کرامت کے اظہار کی کوئی توقع نہیں، صرف وہ میرے وار کا دفاع کر دکھائے
۔ اگر وہ یہاں سے ہاتھ سلامت لے گیا تو تمام قبائل اسے ہادی اور صادق سمجھیں ورنہ جان
لیں کہ وہ جھوٹا اور فتنہ پرداز ہے ۔۔ پیر بابا کے واضح چیلنج کے باوجود بایزید انصاری
کو ان کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

مرشد کی تعظیم و اطاعت

جب شیخ سالار رومی علیہ الرحمۃ نے پیر بابا سید علی ترمذیؒ کو اپنا ماذون اور خلیفہ مجاز قرار دیا تو پیر باباؒ اس ذمہ داری کے بوجھ سے بہت خائف تھے وہ دربار شیخ سالار رومیؒ کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ انہیں ماذونیت کی پابندی سے آزاد کیا جائے ۔ اس پر سالار رومی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ۔" اے سید علی اساتذہ اور مشائخ کرام کے (شرعی) امر کی اطاعت مرید کے فرائض میں داخل ہے"۔ گویا مرید اور شاگرد کا فائدہ اسی میں ہے کہ شیخ اور استاد کی بتائی ہوئی راہ پر چلے۔

فقیری کے درجے

"تذکرہ سلطان الاولیاء" میں ہے کہ فقیر اسے کہتے ہیں جو اپنے ظاہر اور باطن کو آراستہ کرے، ظاہر کو ظاہری اعمال نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے اور باطن کو خلوص اور ایمان سے ۔۔ فقیر کو ان امور کا خیال رکھنا چاہیئے (۱) توبہ (۲) شکر (۳) رضا (۴) صبر (۵) زہد (۶) تواضع (۷) تقویٰ (۸) توکل ۔۔ جو شخص ان اوصاف کو حاصل کرے وہی فقیر ہے ۔۔ علم تصوف اور سلوک میں ان اوصاف کو مقامات کہتے ہیں ۔۔ درویشی کا اصل مقصود حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے۔

رابطۂ شیخ

علماء حقانی اور اولیاء اللہ کی مجالس میں بیٹھنا اٹھنا اس لئے فائدہ رساں ہے کہ اس طرح ان کی صحبت

کے انوار حاصل ہوتے ہیں۔ فن تصوّف و سلوک میں رابطہ شیخ ضروری ہے یعنی یا تو خود حاضری دے یا خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھّے۔

بادشاہوں سے کنارہ کشی

حضرت پیر بابا علیہ الرحمۃ پر کئی حلقوں کی جانب سے الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مغل بادشاہوں کے حامی تھے اور ان کی خوشنودی کے لئے کام کرتے تھے لیکن حضرت پیر بابا ؒ ابتداء ہی سے درباری زندگی اور امیروں اور بادشاہوں کی صحبت اور دنیا داری سے کنارہ کش رہے نہ تو زندگی بھر شہنشاہ ہمایوں سے ملاقات کی نہ کسی اور صاحبِ تخت و تاج سے۔ ان کی ساری زندگی فقر و فاقہ اور درویشی میں گذری۔ کسی سے ان کا اختلاف تھا تو وہ بھی اللہ کے لئے اور دوستی تھی تو بھی اللہ ہی کے لئے۔

۴

مجاہدانہ کارنامے

حضرت سید علی غواص المعروف پیر بابا ترمذی علیہ الرحمۃ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی شرف یہ عطا کیا یہ خانوادہ کسی دور میں بھی عظمت سے محروم نہیں رہا۔ ہر دور میں آج تک اس لڑی میں ایسی نامور ہستیاں موجود رہیں جو یا تو اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت قابل تعظیم تھی یا اپنے کمال علم و فضل کی وجہ سے عوام میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور یا دنیوی وجاہت کے اعتبار سے انہیں معاشرے میں نمایاں مقام حاصل تھا...... نہ صرف مسلمان عوام سادات بونیر اور کونڑ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے بلکہ والیان ریاست، یہاں تک کہ بادشاہان کابل اپنی بیٹیاں اس گھرانے میں بیاہنے کو اپنے لئے باعث یمن و سعادت تصور کرتے رہے۔ اسی نامور گھرانے کے سید اکبر شاہ اور سید عبدالجبار شاہ سوات کے بادشاہ رہے۔ سید محمود شاہ کونڑ پر فرمان روائی کرتے رہے۔ سید جلال و سید شاہ مرتضیٰ پکھلی و ہزارہ کے فاتح قرار پائے۔ فخر مشرق سید جمال الدین افغانی تین چار بادشاہوں کے دور میں افغانستان میں منصب وزارت پر فائز رہے۔ اسی طرح سادات ترمذی سے سینکڑوں دوسرے افراد دین اور دنیا دونوں کی سعادتوں سے بہرہ ور رہے اور معاشرے میں بڑا نام پایا۔

اصل میں اللہ تعالیٰ جب کسی علاقے کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے تو وہاں اپنا کوئی برگزیدہ بندہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اللہ کے اس نیک بندے کی بدولت لوگ رو بہ اصلاح ہوتے ہیں اور معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے کے اہل قرار

پاتے ہیں ..... وہ کیا مبارک ساعت ہوگی جب سلطان الاولیا سالار عطاء اللہ رومی علیہ الرحمۃ نے اپنے نورِ بصیرت کی بنا پر سید علی غواص ترمذی (پیر بابا) کو ہدایت کی تھی کہ وہ کوہستانی علاقہ میں قیام کر کے یوسف زئی اور دوسرے نواحی لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کریں ... کون نہیں جانتا کہ پیر بابا کی آمد سے پہلے یہ علاقے کتنی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے، کفر اور شرک کے اندھیاروں نے انہیں کس بُری طرح سے گھیر رکھا تھا ..... خانہ جنگیاں اور خون خرابے کتنے انسانوں کا خون پی چکے تھے اور افلاس، ناداری اور ذلت نے یہاں کس طرح ڈیرے ڈال رکھے تھے ...... پھر کوہستان سوات اور بونیر کے کفار کی گمراہی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ ... نہ ان کے کوئی مقررہ قاعدے قانون تھے .... نہ وہ کسی خاص مذہبی عقیدے کے پیروکار تھے ...... وہ اُسی طرح زندگی بسر کر رہے تھے جیسے پتھر کے زمانے کا ابتدائی وحشی انسان .... یہ لوگ گانے بجانے اور شراب نوشی کے رسیا تھے ...... اپنی ہی بہن بیٹیوں سے شادی کرنا اس لئے احسن سمجھتے تھے کہ اس طرح (ان کے نزدیک) نسل خالص رہتی ہے ...... ان لوگوں کی زندگی حیوانوں کی تھی .... البتہ شکل و صورت میں گورے چٹے ہوتے تھے اس لئے بعض لوگ انہیں قدیم بت پرست یونانیوں کی نسل سے قرار دیتے تھے بلکہ بقول سید عبدالجبار شاہ ایک بار برطانوی وزیراعظم گلیڈسٹون نے پارلیمنٹ میں اس قدیم یونانی قبیلے کو اپنا ہم قوم جان کر اس کے تحفظ اور سرپرستی کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔

حضرت پیر بابا نے نہ صرف خود ساری زندگی ان وحشی لوگوں کی اصلاح میں گزار دی اور اسلام کا پیغام رحمت ان تک پہنچایا بلکہ ان کے خلفاء اور اولاد نے بھی ان کی وفات کے بعد اس سلسلہ جہاد و تبلیغ کو سرگرمی سے جاری رکھا ..... اس سلسلے میں اخون درویزہ بابا، اخون پنجو بابا، خون سالاک، دیوانہ بابا وغیرہ کے علاوہ خود پیر بابا کے صاحبزادے سید مصطفیٰ اور پوتوں سید عبدالوہاب، سید قاسم اور سید حسن کی مساعی جمیلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کوہستانی کفار کے خلاف اس جہاد کے مرکزی قائد تو حضرت پیر بابا کے پوتے سید عبدالوہاب

تھے۔ رجن کا قیام بونیر کے مرکزی مقام تختہ بند میں تھا تاہم لشکر اسلام کا سالار ہونے کا شرف اخون سالاک کے حصے میں آیا۔ اس جہاد سے قبل اخون درویزہ بابا" تو وفات پا چکے تھے۔ البتہ ان کے ایک صاحبزادے شریک جہاد تھے جو داد شجاعت دیتے ہوئے ایک کافر سردار بزرد کے ہاتھوں شہید ہوئے اور کانجو ضلع سوات میں ان کی تدفین عمل میں آئی ...... وہ شہید بابا" کے نام سے موسوم ہوئے اور آج بھی ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

جہاد کا یہ سلسلہ کوہستان ڈدما سے شروع ہوا جو اس زمانہ میں چغرزئی، بسی خیل اور نصرت خیل کا مسکن تھا۔ یہ علاقہ کوہ سیاہ کے بالمقابل دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ سارا علاقہ پہاڑوں کی نکیلی چوٹیوں سے اٹا پڑا ہے اور بہت ہی دشوار گزار ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تسخیر کے لئے مجاہدین اسلام کو بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا ...... یوسف زئی اور مندانٹر قبائل نے اس جہاد میں دل کھول کر حصہ لیا۔ ہر مسلمان قبیلے کا لشکر اپنے اپنے سردار کی کمان میں اس جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہا خصوصاً خدو خیل کے بھاگو خان نے اپنی بہادری کا سکہ دشمنوں سے منوایا ...... کفار کا لشکر اپنے سردار حاکم ڈدما کی کمان میں تھا۔ وہ ڈدما کے قلعے میں مقیم تھے جو پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ جب گھمسان کا رن پڑا اور فریقین میں دست بدست لڑائی کی نوبت آئی تو علیسی زئی کے قبیلہ حسن زئی کی شاخ کوٹوالی کے ایک جانباز کے تیر سے حاکم ڈدما ہلاک ہو گیا۔ اپنے راجہ کے مرتے ہی کفار نے حوصلہ ہار دیا اور مسلمان لشکر پر کوہستان میں فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ بہت سا مال غنیمت اور قیدی مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ قیدیوں میں راجہ ڈدما کی حسین و جمیل رانی بھی تھی جسے اخون سالاک نے باگو خان کے حوالے کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ بینجبار، چملہ، مچنزئی اور ڈھیری کے موجودہ خوانین اسی رانی کے بطن سے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی شکیل و جیہہ اور بہادر ہیں۔

اخون سالاک نے کافی عرصہ تک کوہستانی علاقے میں قیام کیا۔ ان کی تبلیغ کی بدولت ہزاروں لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنے

دائرہ کار کو کاغان۔ اگرور، گلگت، چترال، مستوج اور کالاش تک وسیع کردیا۔ نہ صرف یہ کہ ان اہل اللہ کی کوششوں سے وہاں کے لوگوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی بلکہ ان کے دلوں میں اسلام سے اتنی محبت پیدا ہوگئی کہ آج سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی یہ لوگ اسلامی تعلیمات کے گرویدہ اور شیدائی ہیں اور کوئی چیز انہیں صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکی۔

سوات

اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت پیر بابا" پہلے پہل سوات اور بونیر کے علاقوں میں آئے تو حالت یہ تھی کہ اکثر لوگ وحشی اور اُجڈ تھے ان کا کام لے دے کے راہزنی اور ڈاکہ زنی تھی۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ شراب کشید کرنے کی بھٹیاں ان حضرات نے اپنی آنکھوں دیکھیں، یہاں کے لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے کا جانی دشمن تھا۔ پہاڑی ندی نالوں کی وجہ سے علاقہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر جگہ کی زبان دوسری جگہ سے جدا تھی .... ایسے لوگوں تک اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام پہنچانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ تاہم پیر بابا" کے ارادت مندوں کی کوششوں سے ... اسلامی تعلیمات کی روشنی ہر قریہ اور ہر بستی تک پہنچی اور لوگ جادۂ حق پر اس پختگی سے گامزن ہوئے کہ آج ..... وہاں شراب نوشی، سود خوری اور بدکاری کا نام و نشان تک نہیں۔ لوگوں کی اکثریت نماز، روزہ کی پابند ہے، عہد کی پابندی اور مہمان نوازی میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ اسلامی غیرت ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔ وہ غریب ہیں لیکن انتہائی خوددار اور غیور وجسور۔

سوات میں کفار کے خلاف جہاد کے قائد سید قاسم بن سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی (پیر بابا") تھے جبکہ سالارِ لشکر ہونے کی سعادت اخون عبدالرحیم" فرزند اخون درویزہ" کو حاصل تھی جہاد کا یہ سلسلہ بالائی سوات کے گاؤں براِنیال سے شروع ہوا ..... غازیانِ اسلام برابر آگے بڑھتے رہے انہوں نے دریائے سوات کے منبع تک کا وسیع و عریض علاقہ کالام، گارائے اور پنجکوڑہ زیرِ نگین کرلیا۔ شدید مقابلوں کے بعد کفار شکست سے ہمکنار ہوئے انہی معرکوں

میں اخون عبدالرحیم دادِ شجاعت دیتے ہوئے ایک کوہستانی کافر بشیزو کے ہاتھوں شہید ہوئے۔
جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ دریائے سوات کے مغربی کنارے پر کانجو نامی گاؤں میں مدفون ہیں
جب سید قاسم علیہ الرحمتہ کا مزار بالائی سوات کے مقام پیرکلی میں ہے۔ . . . . . اللہ نے ان
کی اولاد کو اتنی برکت دی کہ وہ اب تک بالائی سوات کے علاقوں میں آباد ہیں اور کئی گاؤں ان
کی ملکیت ہیں اس طرح دینِ اسلام کے فروغ و استحکام کے لئے جو کارنامہ پیر بابا کی اولاد اور
ان کے ارادت مندوں نے انجام دیا، وہ سلطان محمود غزنوی کے علاوہ آج تک کسی مسلمان
بادشاہ سے بھی بن نہ آیا۔

چترال

ان ڈو مہمات کے علاوہ کفار کے خلاف جہاد کی تیسری مہم سید عبدالوہاب کے فرزند سید جمال الدین اول (المعروف سید جمال) نے وادی کونڑ
کے مقامات لیشت اور سلام پور کے قریبی کوہستانی علاقہ میں عمل میں آئی۔ . . . . . اس جگہ
چترال کی سرحد کے ساتھ کفار قدیم کی کثیر تعداد آباد تھی۔ . . . . . غازیانِ اسلام کی ہر ممکنہ
کوشش کے باوجود یہ سارے کافر قبائل زیر نہ ہو سکے۔ اور کیلاش (کافرستان) میں حالیہ دور
تک ان کی کافی تعداد موجود رہی۔ ان کافروں کے دو بڑے گروہ ہیں، سیاہ کافر اور لال کافر۔
ان کی تھوڑی سی تعداد اب بھی وہاں آباد ہے اور عجیب و غریب عقائد کی حامل ہے۔ جیسا کہ بتایا
جا چکا ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد یہ کافر اہلِ یورپ کے لئے بڑی دلچسپی کا موضوع بن گئے۔
فرنگی کی دلی خواہش تھی کہ کفار کے قدیم کلچر کو بحال رکھا جائے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ
میں وزیر اعظم گلیڈسٹون نے ان سے دلی ہمدردی اور ہم آہنگی کا اظہار بھی کیا۔ گلیڈسٹون کا
اعلان سنتے ہی افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمٰن سمجھ گئے کہ اہلِ کیلاش سے ہمدردی کی
آڑ میں انگریز ان علاقوں پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہے، اس لئے شدید برف باری کے باوجود
انہوں نے ایک فوجی مہم ان علاقوں کو بھیجکر لال کافروں کو مشرف بہ اسلام کر لیا اور اس علاقے
پر تسلط پا کر اس کا نام "کافرستان" سے "نورستان" بدل دیا۔

حضرت پیر باباؒ اور ان کے خلفاء کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ سرزمین یوسف زئی کے لوگوں میں جہاد کا جذبہ آج تک موجزن رہا۔ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والوں میں بھی ان علاقوں کے لوگ پیش پیش رہے۔ پیر سباک میں ۱۸۲۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فولادی لشکر سے ٹکر لینے والے بھی یہی مجاہد تھے اور ۱۸۶۳ء میں امبیلہ کے مقام پر پورے ہندوستان کی فرنگی فوجوں کے دانت کھٹے کرنے والے بھی یہی مردان تیغ آزما تھے..... یہ فخر بھی سوات، بونیر اور کوہستانی علاقوں کو حاصل ہوا کہ آج تک اس مٹی پر کسی غیر مسلم کو قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

اپنی خود نوشت میں سید عبدالجبار شاہ کا کہنا ہے کہ حضرت پیر باباؒ کی آمد سے قبل خود پختون قبائل بھی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے تھے ..... ہر طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلے کو اس کے ملک سے نکال کر اس پر خود قابض ہو جایا کرتا تھا۔ مثلاً خلیل مہمند نے دوسرے غوریا خیل قبائل کو نکال کر پشاور کے نواحی زرخیز علاقوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ اسی طرح دلازاک کو بھی اپنے پہلے مسکن سے بھگا دیا گیا تھا تاہم پیر باباؒ، اخون درویزہؒ اور دوسرے اہل اللہ کی تربیت سے متاثر ہو کر پختون قبائل باہمی خانہ جنگیوں سے باز آگئے اور اس کے بعد کسی ایک قبیلے نے دوسرے پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

اسی طرح ان صوفیائے کرام کی تعلیمات کے نتیجے میں سرحدی علاقوں میں علماء اور صوفیاءؒ کی بڑی قدر افزائی ہوئی۔ لوگوں نے اپنی زمینیں تبرکاً اور تیمناً سادات کرام، اخون خیل اور کاکا خیل حضرات کو دے دیں، ہر دینی اور دنیوی معاملے میں ان حضرات کی رائے کو صائب سمجھ کر فوقیت دی جانے لگی۔ لوگ علماء کی ہدایات پر چلنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھنے لگے، یہاں تک کہ سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے قریباً ہر معرکے میں مجاہدین کی قیادت انہی علماء اور صلحاء کے ہاتھ میں رہی ..... یہی حضرات لوگوں کے باہمی تنازعات ختم کراتے ..... دو قبیلوں میں کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا تو غیر جانبدار

ثالث بن کر اسے حل کرتے۔

سادات کونٹر کو صوبہ سرحد، قبائلی علاقوں اور افغانستان میں خصوصی مقام حاصل رہا۔ سارے پختون قبائل ان کی قیادت پر متفق رہے۔ سبھی ان کا یکساں احترام کرتے رہے ..... حضرت پیر بابا'' کی وفات کے بعد اس علاقے کے لوگوں اور حاکموں نے خطہ کونٹر حضرت پیر بابا کی اولاد کو جاگیر کے طور پر بطور عطیہ دے دیا۔ یہاں تک کہ شاہی خاندان اپنی بیٹیوں کے رشتے ان سادات سے کرنے کو باعث سعادت سمجھا کرتا....... امیر دوست محمد خان کی ایک بیٹی (یا بہن) کونٹر کے سید محمود شاہؒ سے بیاہی گئی تھی۔ اسی طرح امیر حبیب اللہ خان نے اپنی دو بیٹیاں سادات کونٹر کے رہنما شیخ باچا میر صاحب جان'' کے دو بیٹوں کے عقد میں دے دی تھیں.... اسی خانوادہ کے قابل فخر فرزند سید جمال الدین افغانی'' امیر دوست محمد خان، امیر محمد افضل اور امیر محمد اعظم کے عہد وزارت کے منصب پر فائز رہے۔

ایک وقت تھا جب کشمیر، کاغان، پکھلی، ہزارہ، بونیر، سوات اور کونٹر کے وسیع علاقے پیر بابا'' کے گھرانے سادات کونٹر کے تصرف میں تھے، وہ نہ صرف ان علاقوں کے دنیوی حکمران تھے بلکہ وہاں کی ساری آبادی کے دینی پیشوا اور رہنما بھی تھے، دین و دنیا کی یہ سعادتیں ہمارے ہاں پیر بابا'' کی اولاد کے علاوہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہوں ...... چونکہ یہ حضرات دینی اور روحانی اعتبار سے بڑی عزت و احترام کے مالک تھے۔ اس لئے سید جمال رثانی (افغانی) کو شیخ الاسلامؒ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

فتح پکھلی آج کل پکھلی ضلع مانسہرہ کے زرخیز میدانی علاقہ کو کہا جاتا ہے لیکن مغلیہ دور تک یہ ایک الگ آزاد ریاست تھی ...... '' تاریخ ہزارہ'' کے مؤلف محمد ارشاد خان کا کہنا ہے کہ

'' موجودہ ضلع آج کل ڈویژن، ہزارہ انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ سکھوں کے عہد تک اس کا پورا نام ہزارہ قارلق تھا اور اس سے مراد تحصیل ہری پور کا وہ میدان تھا جو اٹک تک پھیلا ہوا

تھا۔ ترکوں کے عہد میں یہ میدان ہزارہ قارلق اس وسیع ولایت پکھلی کا ایک حصہ تھا۔ جو کشمیر راولپنڈی اٹک اور گلگت کے تمام درمیانی علاقوں پر مشتمل تھی۔"

پکھلی پر حضرت بابا کے خاندان کی حکومت کیسے قائم ہوئی؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سید عبدالجبار شاہ کا کہنا ہے کہ

"حضرت سید قاسم نبیرۂ حضرت سید علی غواص ترمذی (پیر بابا) کا ایک فرزند سید جلال چھوٹی عمر میں طلب علم کی خاطر اپنے وطن سے پکھلی پہنچا جو شمالی ہزارہ میں ایک زرخیز خطہ تھا اور جہاں قدیم ترکوں کی ایک وسیع و عریض سلطنت عہد قدیم سے تھی۔ یہ لوگ اغلباً تیمور کے ہمراہ آئے تھے تاہم اس علاقے میں ہندوں کے جوار میں رہتے رہتے ان میں ہندوانہ رسمیں گھر کر چکی تھیں۔ ان دنوں اس ریاست کا فرمان روا سلطان محمود نامی ایک ترک تھا...... چونکہ اس کے دارالحکومت میں بہت سے علماء اور اہل کمال موجود تھے اس لئے دور دور سے لوگ ان سے فیض پانے پکھلی آیا کرتے تھے، سید جلال بھی اسی سلسلے میں یہاں وارد ہوئے...... وہ نہایت شکیل اور وجیہہ تھے۔ چہرے بشرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی عظیم خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ تاہم ان دنوں چونکہ طالبعلموں کو استادوں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ اپنے کپڑے خود دھونے ہوتے تھے اور مسافرانہ زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا حسب نسب کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ سید جلال نے بھی یہ نہ بتایا کہ وہ کس نامور خاندان کے فرد ہیں۔ اتفاقاً راجہ سلطان محمود نے انہیں دیکھا تو بڑا متاثر ہوا...... اس کے کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ سید قاسمؒ کے فرزند ہیں جو ان دنوں سارے علاقہ یوسف زئی اور افغانستان کے روحانی اور دنیوی پیشوا تھے اور جن کی کوششوں سے سارے علاقے میں اسلام کی روشنی پھیلی تھی...... اس پر سلطان محمود نے سید جلال کو دربار میں بلایا۔ بڑی عزت و تکریم کی اور کچھ عرصہ بعد اپنی بیٹی سے جو نہایت ہی عقلمند اور ہمہ صفت موصوف خاتون تھی اس کی شادی کر دی...... ساتھ ہی بھوگڑمنگ کا علاقہ انہیں جاگیر کے طور پر دیا جہاں وہ امن

وچین سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس پہ ترک درباریوں اور سلطان محمود کے رشتہ داروں نے سید جلال کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور طرح طرح کی سازشیں کھڑی کر دیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ سلطان محمود سید جلال کے قتل کے درپے ہو گیا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنے سپاہیوں کا ایک جتھہ بھیجا کہ وہ چپکے سے سید جلال کا کام تمام کر دیں۔ سید جلال ان سازشوں سے بے خبر تھے۔ اتفاق سے وہ راجہ سلطان محمود سے ملنے کے ارادے سے پکھلی آ رہے تھے کہ راستے میں ڈگ کے مقام پہ ریہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل ڈاڈر سینی ٹوریم قائم کیا ہے) ان کا آمنا سامنا راجہ کے مسلح سپاہیوں سے ہو گیا۔ انہیں دیکھتے ہی راجہ کے سپاہیوں نے ان پہ حملہ کر دیا۔ وہ شدید زخمی ہوئے تاہم گھوڑا دوڑاتے ہوئے واپس اپنے گھر بھوگڑ منگ پہنچ گئے...... ان کی بیوی معاملے کو بھانپ گئی تاہم اس نے انتہائی رازداری سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے قلعے کے ایک کمرے میں لٹا دیا۔ مرہم پٹی کی اور تیمارداری میں لگ گئی۔ صحت یاب ہونے پہ سید جلال نے علاقہ سوات و بونیر سے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور پکھلی پہ حملہ کر دیا۔ اس موقع پہ راجہ سلطان محمود شہنشاہ ہند سے ملاقات کی خاطر دہلی گیا تھا اس لئے سید جلال کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور وہ آسانی سے سارے علاقہ پر قابض ہو گیا"۔

" تاریخ ہزارہ" مؤلفہ کیپٹن ویس میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

پیر بابا (سید علی غواص ترمذی) کی چوتھی پشت سے سید جلال بابا ملک بونیر سے اپنے ساتھی مراد خان (مورث اعلیٰ خوانین گڑھی حبیب اللہ) کشمیر کو جاتے ہوئے ریاست پکھلی کے صدر مقام گلی باغ میں آ کر ٹھہرے۔ سلطان محمود ترک (راجہ) اس ملک کا فرمان روا تھا۔ اس نے انہیں خاندانی معزز سمجھ کر بڑی خاطر مدارات کی۔ کچھ عرصہ بعد سلطان محمود نے اپنی بیٹی سید جلال سے بیاہ دی اور علاقہ بھوگڑ منگ جہیز میں دے کر انہیں وہاں آباد کر دیا...... اس قرابت داری پہ سید جلال کو سلطان محمود کے معاملات میں عمل دخل حاصل ہو گیا...... سید جلال وہاں رہے تو

ان کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اس پر سلطان محمود انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی فکر میں لگ گیا۔ اس نے اپنے آدمی سید جلال کے قتل کے لئے بھیجے۔ ان لوگوں اور سید جلال میں ڈگ کے مقام پر آمنا سامنا ہوا۔ سید جلال زخمی تو ہوئے لیکن موت سے بچ گئے۔ . . . . . صحت یاب ہونے پر وہ بونیر اور یوسف زئی کو چلے گئے وہاں سے لشکر جرار جمع کیا اور گلی باغ (پکھلی) پر حملہ کر دیا۔۔ سلطان محمود ان دنوں دہلی گیا ہوا تھا۔ اس لئے آسانی سے وہ سارے علاقہ پر قابض ہو گئے"۔

بتایا جاتا ہے کہ ترکوں نے گلی باغ کے خوبصورت شہر کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ سارا شہر جل کر خاکستر ہو گیا۔ سلطان محمود کے بیٹے اور حرم کی خواتین علاقہ کونش کو چلے گئے اور روپوش ہو گئے۔ اس طرح پکھلی میں ترکوں کا اقتدار ختم ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۰۳ عیسوی میں پیش آیا۔

فتح ہزارہ

۲۰ ۔ ۱۹ ۱۷ء میں ترکوں کی خانہ جنگی اور عیاشی کے زمانہ میں سید عبدالوہابؒ نبیرہ حضرت پیر باباؒ کے پوتے سید شاہ مرتضیٰ (ابن سید جمال) نے جدونوں کا لشکر لے کر علاقہ گدون سے دریائے سندھ کو عبور کر کے ہزارہ پر حملہ کیا اور ہری پور سے موجودہ ریلوے لائن کے ساتھ علاقہ فتح کرتے ہوئے ترکوں کے صدر مقام دمتوڑ پر قبضہ کر لیا اور تمام علاقہ اورش تا منگل (صد مقبوضہ صواتیان) پر قبضہ کر لیا (مفصل تذکرہ آگے آئے گا)

۵

جھوٹے مدعیان کا بطلان

اس شخص کی بدقسمتی کا اندازہ لگائیے جو ایک ایک کوڑی جمع کر کے کچھ پونجی بنائے پھر عمر بھر کی اس کمائی سے خالص سونا خریدنے کی نیت سے بازار جائے لیکن کوئی عیار اور طرار شخص اس کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر سونے کی بجائے اسے پیتل تھما دے۔ خالص سونا تو تبھی ہاتھ آئے گا جب یا تو خریدار کو اس کی پرکھ ہو یا اسے کوئی ایسا مخلص، بے غرض اور ہمدرد مشیر مل جائے جو کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ــــ ایسا ہی کچھ حال بساطِ طریقت کا بھی ہے ــــ انسان پر کوئی بپتا پڑتی ہے تو اس کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے۔ اسے اس سلسلے میں کسی مردِ راہ دان کی ضرورت ہوتی ہے اگر خوش بختی شامل ہو اور کوئی اللہ کا بندہ مل جائے تو "طے شود منزلِ صد سالہ بہ آہے گاہے" کا سماں دیکھنے میں آتا ہے ــــ لیکن کھرے کے ساتھ کھوٹا، اچھے کے ساتھ برا اور اصل کے ساتھ دجل کہاں اور کس جگہ نہیں ہوتا ــــ مولانا جلال الدین رومیؒ ایسے صاحب نظر کو بھی تسلیم ہے کہ

؎ اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

ظاہر ہے کہ مرشد کی ضرورت جتنی اہم اور اس کی تلاش جتنا مشکل مرحلہ ہے،

جعلی اور نام نہادِ "پیروں" اور پیشواؤں سے بچنا اور ان کے دام میں گرفتار نہ ہونا اس سے بھی مشکل تر کام ہے ۔۔۔ مرید اور طالب کے لئے بھی لازم ہے کہ طلبِ صادق رکھتا ہو۔۔ یہ نہیں کہ وہ صرف دُنیوی مقاصد کے لئے گنڈے تعویذ لینے کو اپنا مقصودِ حیات سمجھے بیٹھا ہو ۔۔۔ جادو اور ٹونے ٹوٹکے حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔ یا مرشد کی کرامات اور خوارق عادت کو اس کا کمال سمجھا ہو ۔۔۔ قرآن مجید اس ضمن میں ہمارا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ ضرور ایسا ہوگا جو دوسروں کی اصلاح اور رہنمائی کرتا رہے گا۔ اور یہ کہ "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" کے ارشادِ ربّانی کی تعمیل میں ایسے سچے اور اچھے لوگوں کی صحبت اور بیعت ضرور اختیار کرنی چاہیئے ۔۔ ایسے حقیقی نائبانِ رسول ؐ اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں ، ارکانِ دین میں عملی رسوخ سنّتِ الٰہی کے مطابق انہی کی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت کہتے ہیں ۔۔۔ جس کی تشریح فنِ تصوّف کے ماہر امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے رسالہ "القول الجمیل" یوں کرتے ہیں کہ

" بیعت سُنّتِ رسول ؐ ہے اور بیعت کا اطلاق صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہدِ نبوّت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں۔ مثلاً بیعتِ خلافت، بیعتِ جہاد، بیعت توبہ وغیرہ ۔۔۔ صوفیہ کی مروّجہ بیعت، بیعت تقویٰ میں داخل ہے ۔۔ خلفائے راشدین کے دور میں اس بیعت کی علیحدہ ضرورت نہ تھی ، اس لئے کہ ان سے جو بیعت خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل وشامل ہوتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر جب ملوک وسلاطین کا دَور دَورہ ہوا اور خلافت رسول ؐ کی بیعت بند سی ہو گئی تو صوفیائے کرام نے بیعت تقویٰ کی سنت کو پھر سے زندہ کیا۔"

کوئی خضرِ راہ ہو تو بھٹکنے کا خدشہ یقیناً ختم ہو جاتا ہے، عشق و محبت الٰہی کے اس راستے میں خضرِ راہ کی ضرورت کو حکیم الامت علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں کہ

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر　　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

مرشد حقیقی میں کن صفات کا ہونا ضروری ہے اس سلسلے میں جہاں پیر بابا سید علی غواص رحؒ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا بھی کہنا ہے کہ مرشد حقیقی وہ ہے کہ

"اس کو مشائخ کی صحبت رہی ہو اور اس نے ان سے ایک عرصۂ دراز تک ادب اور قاعدے سیکھے ہوں اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو ـــــ اور یہ شرط اس لئے ہے کہ عادت الٰہی یہی ہے کہ کسی کو مراد اس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ مراد پانے والے سے صحبت اور تربیت نہ رکھتا ہو"

گویا اس راہ میں بھی مردِ راہ دان کا ہونا لازم ہے، راہبر راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوتا ہے، ایک دوسرے عالمِ دین کا کہنا ہے کہ:

"شیخ وہ مصلح ہوتا ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے۔ پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس سے زائد اور کچھ نہیں کہ جس کے صالح اور صادق ہونے پر بھروسہ ہو اور جس کی شان طاعت و تقویٰ سے اپنا ضمیر و وجدان بھی مطمئن ہو۔ اس کے اتباع کا مقصد و اہتمام کیا جائے اور اطاعت و نیاز مندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دی جائے"

اخون درویزہ بابا رحؒ بھی اپنے مرشد حضرت پیر بابا رحؒ کی زبان سے مرشدِ کامل کی صفات بعینہٖ وہی بیان کرتے ہیں جو شاہ ولی اللہ دہلوی رحؒ اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے :۔

" طالب تصوف کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مرشد کامل کی صحبت میں عمرِ عزیز صرف کرے۔ وہ مرشد کامل ہو۔ اور اس میں وہ صفات موجود ہوں جو تصوف کی کتابوں میں مذکور ہیں ــــ اور وہ شخص خود کسی مرشد کامل سے تربیت یافتہ اور ماذون ہو۔ جب تک ایسا نہ ہو، وہ کسی اور کو کیا راستہ بتلائے گا" (تذکرہ طلسم)

نسبت کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

" صوفیائے کرام کی نسبت نہایت ہی غنیمت ہے۔ اس کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی شرط ایسی ہے جو ہر مسلمان میں ہونی ضروری ہے۔

۱۔ اوّل بقدر ضرورت علمِ دین سیکھنا (خواہ کتابوں سے خواہ عالمانِ دین سے پوچھ پوچھ کر) عربی، فارسی، اُردو یا جس زبان میں بھی ہو، ضروری دینی مسئلوں سے آگاہی ضروری ہے

۲۔ جو شرعی مسئلے سیکھے جائیں اُن پر پختہ اور مسلسل عمل پیرا رہنا۔ نیز نفس کی خواہشوں اور لوگوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرنا"

پھر جس طرح جسمانی بیماری کی صورت میں انسان بہتر سے بہتر اور ماہر طبیب سے رجوع کرتا ہے، اسی طرح روحانی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے بھی ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ مُرشدِ کامل کی تلاش پوری تحقیق اور جستجو سے کرے، "تذکرہ سلطان الاولیا" میں حضرت پیر بابا سے پیر کامل کی یہ خصوصیات شمار کی گئی ہیں:۔

اوّل۔ علوم شرعی سے بقدر ضرورت واقف ہو تاکہ فساد عقائد اور اعمال نامشروع سے محفوظ رہے اور مریدوں کو اپنی علمی استعداد اور باطنی بصیرت کی بدولت خلاف شرع اعمال سے بچائے رکھے ــــ ظاہر ہے کہ جو شخص اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی نہ رکھتا ہو اور شریعت محمدیہ پر کاربند نہ ہو۔ وہ دوسروں کی کیا رہبری کرے گا۔ بقول" او خویشتن گم ست کرا رہبری کند"

دوم۔ مُرشد مُتقی ہو یعنی کبیرہ گناہوں بلکہ صغیرہ گناہوں سے بھی مجتنب ہو۔ ہر ایک کا خیر خواہ ہو۔ خوش خلق اور نرم کلام ہو، سخت دل اور بخیل نہ ہو۔

سوم : تارک الدنیا اور راغب الی اللہ ہو، ظاہری عبادات اور باطنی اطاعات پر مداومت رکھتا ہو۔ مہمان نواز اور مہمان پسند ہو۔

چہارم : مریدوں کے اعمال پر نگران ہو۔ ان کے خلافِ شرع اعمال پر سرزنش کرے اور ان کے قول و فعل کا محاسبہ کرتا ہے۔

پنجم : مرشد خود بزرگانِ دین کی صحبت سے فیض یافتہ ہو تاکہ مریدوں کے نفوس پر بھی اثر انداز ہو سکے۔

ششم : مرشد کے اخلاق و عقائد، اعمال و افعال اسوۂ حسنہ رسولِ مقبول ؐ کے عین مطابق ہوں اور مرشد خود کامل ہونے کا دعویٰ نہ کرتا ہو۔

ہفتم : اس مرشد کے خلفاء بھی پابند شریعت ہوں ۔۔۔ اس مرشد کی مجلس میں بیٹھنے والوں کی اکثریت عالم فاضل اور پابند شریعت لوگوں کی ہو۔ اس مرشد کامل کی اصل غرض یہ ہو کہ اس کا ہر مرید شریعت محمدیہ کی پیروی میں سبقت لے جانے والا ہو۔

حضرت پیر باباؒ کے نزدیک مرشد کی ضرورت اس لئے بھی پیش آتی ہے کہ صرف ظاہری احکام پر بے دلی سے عمل کرنے سے بھی دل کی درستگی نہیں ہوتی، مرشدِ کامل اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ مرید کے باطن کو متاثر کرے تاکہ مرید تقویٰ، طہارت اور خلوص سے بہرہ ور ہو کر معرفت عبادت الٰہی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک قلب ہی ہمارے جسم میں مقام الٰہی ہے۔ قلب منور ہو تو افکار میں انقلاب آجاتا ہے اور افکار بدلیں تو اعمال بھی بدل کر رہ جاتے ہیں۔ بقول کسے

دل کے سنبھالنے سے سنبھلتا ہے آدمی
جس نے اسے سنبھال لیا خود سنبھل گیا

حضرت پیر باباؒ کی نظر میں مرید کے لئے جہاں بدنی عبادات ضروری ہیں وہیں کثرت ذکر بھی لازم ہے۔ ذکر الٰہی سے باطن متاثر ہوتا ہے اور انسان کے تمام اعمال رضائے الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔

صوفیائے کرام نے جو طریق فقر اپنایا ہے وہ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" کے فرمان نبوی کی عین متابعت ہے۔ فقر محمدی کو شریعت اسلامیہ سے علیحدہ نظام قرار دینا غلط ہے۔ عارف کامل شیخ احمد بن ابراہیم الواسطیؒ کا کہنا ہے کہ

"اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے جس کی جڑ مضبوط اور جس کی شاخیں بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو۔ اور انہی کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے۔ جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے۔ اور بعد میں آنے والوں کی درویشی اختیار نہ کرو۔ کہ پانی سرچشمہ سے دور جا کر گدلا ہو جاتا ہے اور اس کا اصل رنگ قائم نہیں رہتا۔"

گویا سرور کائنات، فخر موجودات، رحمۃ للعالمین، خاتم النبیینؐ کا اسوۂ حسنہ ہی وہ معیار ہے جس پر کسی مرشد اور اہل حق کے اعمال کو پرکھنا چاہیئے۔ "بمصطفیٰ برساں خویش را" ہی کمال ولایت اور کمال تصوف ہے اور اس اسوۂ مبارکہ کے خلاف جو بھی ہے بے حقیقت ہے کہ

خلاف پیمبر کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اس فقر محمدیؐ پر کاربند ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جسم بھی گناہ سے محفوظ رہے اور دل میں بھی غیر اللہ کا ٹھکانہ نہ ہو۔ اور خدا کی طلب اور اسوۂ حسنہ محمدیؐ پر عمل پیرا ہونے کی تڑپ دل پر اتنی غالب آجائے کہ باطل خیال اس میں سما ہی نہ سکے۔ گویا دل صرف محبوب حقیقی اور مطلوب اصلی کا مقام بن کر رہ جائے

مقامات فقر کی مزید تشریح حضرت پیر باباؒ کے نزدیک یہ ہے کہ فقیری کا ایک درجہ ولایت عامہ ہے جو ہر متقی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کا دوسرا درجہ ظاہری عبادات کے علاوہ باطن یعنی قلب کو اللہ کی یاد میں مشغول

رکھتا ہے۔ اس درجہ کو اہلِ تصوف وسلوک "نسبت" کہتے ہیں۔

جہاں تک پیر بابا سید علی غواص ترمذی علیہ الرحمۃ کی تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں یا جہاں تک ان کے مشہور ماذون اور خلیفہ اخون درویزہ بابا نے ان کی تشریح کی ہے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ شریعت کے نقطۂ کمال ہی کا نام طریقت ہے۔ جہاں پیر بابا اور ان کے ساتھیوں نے عوام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ارکان خمسہ پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا وہیں انہوں نے اس دور کے صوفیائے خام کے پھیلائے ہوئے توہمات اور باطل عقائد کے مٹانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پیر بابا اپنی باطنی بصیرت سے یہ بات بھانپ گئے کہ اس دور میں شرک و بدعت کا جو بازار گرم تھا اور مطلب پرست عناصر جس طرح عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل رہے تھے اس میں عوام کا زیادہ قصور نہ تھا۔ بلکہ بیسیوں مقامات پر پیر بابا اور اخون درویزہ نے بحیثیت مجموعی پختون قوم کی بنیادی خوبیوں اور جذبۂ جہاد کی بڑی تعریف کی ہے۔ البتہ وہ زمانہ ایسا تھا جب ان علاقوں میں دینی تعلیم کے لئے کوئی ادارہ تھا نہ حکومت کی جانب سے فروغ و اشاعت تعلیم کا کوئی اہتمام موجود تھا۔ آمدورفت کی آسانیاں میسر تھیں نہ رسل و رسائل کا انتظام افلاس و نکبت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کوہستانی علاقوں کے مردانِ جفاکش کی اکثریت دولت اسلام سے بہرہ ور تو تھی تاہم ابھی ان کے رسم و رواج اور طور طریقوں پر سابقہ مذاہب کی چھاپ ضرور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی لوگ مسئلہ تناسخ، سحر و ساحری، شگون اور بدشگونی وغیرہ کے ہندوانہ اثرات سے پوری طرح پیچھا نہ چھڑا سکے تھے، اپنی سادگی کی وجہ سے وہ اکثر ولایت و بزرگی کے غلط دعوے کرنے والوں کے جال میں گرفتار رہتے۔ فال بینی، ستارہ پرستی اور زائچہ بینی کے مشغلے معاشرے میں گھر کر چکے تھے اور اسی طرح اور کئی معاشرتی خرابیاں بھی ماحول کو بری طرح متاثر کر رہی تھیں۔ حضرت پیر بابا اولین ہستی تھے

جنہوں نے اپنے ماحول کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

اس سلسلے میں پیر بابا (اور بالخصوص ان کے ماذون اخون درویزہ باباؒ) کو سب سے زیادہ بایزید انصاری اور اس کے جانشینوں کا مقابلہ کرنا پڑا (مفصل ذکر علیحدہ باب میں کیا گیا ہے) تاہم بقول اخون درویزہ دوسرے تیس کے قریب جھوٹے مدعیان ولایت و نبوت سے بھی پیر باباؒ کو واسطہ پڑا۔ حضرت پیر باباؒ نے علمی دلائل اور باطنی نورانیت کی بدولت ان خود ساختہ پیروں کو لاجواب کر دیا اور انہیں راہِ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ یہ حضرت پیر باباؒ کی تعلیمات اور مساعیٔ حسنہ ہی کا نتیجہ تھا کہ ہر جگہ ان باطل پرستوں کا طلسم ٹوٹا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قعر گمنامی میں جا گرے۔ لوگ ارکان اسلام کے پابند ہوتے گئے اور آج چار ساڑھے چار سو سال گذرنے پر بھی ان لوگوں میں عقائد کی پختگی اور دینِ اسلام سے شیفتگی پائی جاتی ہے اور وہ اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی جانوں تک کو قربان کرنے پر تیار ہیں۔

اخون درویزہ باباؒ لکھتے ہیں کہ حضرت پیر باباؒ جس جگہ بھی جاتے لوگوں کے دینی احوال معلوم کرتے وہاں کے علماء اور صوفیاء سے ملاقات کرتے، ان سے خلوت میں مختلف اسلامی مسائل پر بات چیت کرتے۔ اگر انہیں کہیں کوئی خامی اور فروگذاشت نظر آتی تو اُسے دور کرنے کی سعی فرماتے۔ لوگوں کو شریعت مطہرہ کی برکات سے مطلع کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں وہ تاثیر بخشی تھی کہ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتے۔ ان کے دلائل میں وہ زور تھا کہ کوئی غلط کار ان کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکتا۔ اگر ان علاقوں میں کوئی پیر۔ فقیر وارد ہوتا تو لوگ اُسے حضرت پیر باباؒ کے پاس لے آتے، وہ اس کے عقائد کو جانچتے اور اس کے غلط عقیدوں کی اصلاح کر دیتے۔

اس سلسلے میں حضرت اخون درویزہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک

دفعہ پیر عمر اور پیر سالاک (یا چالاک) دو بھائی جو خٹک قبیلہ سے تھے۔ سرزمین یوسفزئی میں دارد ہوتے، لوگ انہیں پیر باباؒ کے پاس لاتے تاہم ان کی آمد سے پہلے ہی پیر باباؒ نے اپنی بصیرت سے تاڑ لیا کہ ان کا مبلغ علم کیا تھا؟۔ چنانچہ پیر باباؒ نے کاغذ کا ایک پرزہ مجھے دے کر کہا کہ اسے اپنی پگڑی میں رکھ لو۔ جب وہ دونوں بھائی حضرت پیر باباؒ کے پاس پہنچے تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ ایک کہتا "سات آسمان میری زد میں ہیں۔" دوسرا کہتا" مجھ پر ابھی ابھی انکشاف ہوا ہے کہ ساتویں آسمان سے ایک بلا یہاں نازل ہونے والی ہے۔" اس پہ پیر باباؒ نے میری پگڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا، آسمان تو بہت دور کی بات ہے۔ تم پہلے یہ تو بتاؤ کہ اس پگڑی میں کیا رکھا ہے؟ وہ کھسیانے ہوکر رہ گئے، تاہم اپنی خفت کو چھپانے کے لئے کہنے لگے۔ اس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ جب مجلس کے سامنے پگڑی کھول گئی تو کاغذ کا ایک خالی پرزہ نکلا ۔ اس پہ اُن دونوں کو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی بارہا ایسا ہوتا کہ پیر باباؒ ایسے گمراہوں کا مناظرہ اور مجادلہ اخون درویزہؒ سے کرا دیتے اور خود ان جھنجھٹوں میں نہ پڑتے۔

پیر پہلوان :- اخون درویزہ کا کہنا ہے کہ ایک شخص خراسان سے آکر جلدرہ کے مندان قبیلہ میں مقیم ہوگیا۔ بڑا طرار اور باتونی تھا۔ رافضی عقیدے کا حامل تھا اور اکثر خلفائے ثلاثہ کے خلاف الزام تراشی کرتا رہتا تھا۔ اس نے وہیں شادی کرلی۔ خود تو آزاد منش تھا ہی، لوگوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اس کی بری صحبت کی بنا پہ اکثر نوجوان چرس اور بھنگ کے عادی ہوگئے اور داڑھیاں منڈانے لگے۔ اس پر سارے علاقہ کے لوگ انہیں" کافر خیل" کہہ کر پکارنے لگے۔ اس شخص کو پیر پہلوان کہا جاتا تھا۔ جب وہ فوت ہوا۔ اور لوگ اس کو قبر میں اتارنے لگے تو دیکھتے ہی دیکھتے قبر اس پر تنگ ہوگئی اور اس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ یہ حال دیکھ

کر دفن کو آنے والے لوگ ہیبت زدہ ہو گئے اور جلدی جلدی اس پر مٹی ڈال کر چلے گئے۔ بہت سے لوگ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔

لال شہباز قلندر

ایک بدعقیدہ شخص، جو لال شہباز قلندر کے نام سے مشہور ہوا۔ باہر سے آکر موضع لنگر میں سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ وہ ایک بھنگ پینے والا انسان تھا۔ ظہیر الدین بابر نے بھی توزک میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے دلازاک قوم میں بہت سے لوگوں کو مرید کر رکھا تھا۔ اس لئے اس کے دماغ میں بادشاہی کا سودا سما گیا تھا چنانچہ اس نے علاقہ ڈھوک پر حملہ کیا جو تنولی لوگوں کی ملک تھا۔ وہ اسی جنگ میں مارا گیا۔ جس جگہ اسے دفن کیا گیا اس کا نام شہباز گڑھ پڑ گیا۔

اس قلندر کے حالات میں اخون درویزہ مزید لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے مریدوں کے لئے نماز بھی معاف کر رکھی تھی۔ ایک ولی اللہ سید محمود علیہ الرحمۃ کی ہڈیاں قبر سے نکلوا کر پھینک دی تھیں اور اس احاطہ کو میکدے کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کے بعض مرید جوگی تھے۔ وہ اکثر ایک ابلق گھوڑے پر سواری کیا کرتا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ میں عنقریب بادشاہ بنوں گا، اسی زعم میں اس نے تنولیوں کے ملک پر حملہ کیا، جہاں دربند کے پہاڑوں میں ہلاکت کو پہنچا۔

پیر طیب

ایک اور مدعی ولایت پیر طیب تھا جو خلجی افغانوں کے خاندان کا فرد تھا۔ یہ شخص عقیدہ تناسخ کا قائل تھا۔ اس کا قیام مندانڑ قبیلہ میں تھا۔ اس نے اپنے مریدوں کو ان باتوں میں کھلی چھٹی دے رکھی تھی جن سے اسلام منع کرتا ہے۔ جب اس نے غوث خراسان سید علی غواص ترمذی دپیر باباؒ کی آمد کا سنا تو چٹھی لکھ کر انہیں دعوتِ مجادلہ دی لیکن بعد میں اس کی جرأت نہ ہوئی کہ ان کے سامنے آئے، اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ اس کی دعوت اس لئے

موجب برکت ہوئی کہ پیر بابا نے سرزمین یوسف زئی پہنچ کر لاکھوں انسانوں کو فیض پہنچایا بلکہ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ پیر طیب خود آکر حضرت پیر بابا کے ہاتھ پر تائب ہوا۔ بیعت کی اور توبہ گار ہو کر نیک عملوں میں داخل ہو گیا۔ پیر طیب نے نہ صرف اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف کر کے معافی مانگی بلکہ پیر بابا کی صحبت سے اس کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب آگیا۔

پیر ولی برٹیچی

پیر ولی برٹیچی بھی عقیدۂ تناسخ کا پرچارک تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک آخرت کی سزا و جزا کا کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ اس جنم کے بعد رُوح پھر کسی اور صورت میں رونما ہوتی ہے۔ چونکہ موجودہ زندگی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اس لئے ان کی نظر میں بعد الموت سزا و جزا کا نظریہ بے معنی ہوتا ہے۔ اس شخص کا قیام بھی قبیلہ منڈانڑ میں تھا۔ تناسخ کا عقیدہ ہنود کے عقائد میں سے ہے۔ تناسخیوں کا خیال ہے کہ ارواح و نفوس تمام حیوانات ناطق و مطلق میں مشترک ہیں۔ اس شخص نے اور بھی بہت سی باتیں گھڑ رکھی تھیں جن کی وجہ سے لوگوں کی کثیر تعداد اس کے دامِ تزویر میں پھنس چکی تھی۔

کریم داد

کریم داد نامی افغان غورغشتی بھی ایک ایسا ہی بدعقیدہ شخص تھا، اس کا گذر بسر بھی قبیلہ منڈانڑ میں تھا۔ (کریم داد نام کا ایک شخص بایزید انصاری (پیر روشن) کے اخلاف میں سے بھی تھا لیکن یہ کوئی دوسرا شخص ہوا ہے)

شیخ الیاس

شیخ الیاس بھی سرزمین یوسف زئی کا ایک خود ساختہ شیخ تھا۔ یہ بظاہر بہت عابد و زاہد انسان تھا، مرتبہ کشفِ جنات تک پہنچ گیا تھا تاہم چونکہ بے علم اور جاہل تھا اور کسی مرشد کامل اور شیخ محقق کا دست گرفتہ بھی نہ تھا، اس لئے کبھی ایک راستہ پر چل نکلتا تھا کبھی

دوسرے پر، بالآخر جبریہ مذہب اختیار کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ پیرولی کی صحبت میں رہنے سے اور بھی گمراہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی انکار کرنے لگا۔ کبھی گلے میں زنار پہن لیتا، کبھی کوتی اور کھیل کھیلنے لگتا۔ ایک دن ملّا علیلی ملتانی نے اس کو متنبہ کیا کہ خلافِ شرع چکر میں کیوں پھنس گئے ہو؟ جس پر اس نے کہا کہ شریعت کا راستہ بہت کھلا ہے۔ لوگ خواہ مخواہ تنگ دلی سے کام لیتے اور دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں ۔۔۔ بہرحال ملّا علیلی کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی۔ وہ گاہے گاہے اخون درویزہ بابا کے پاس بیٹھنے اٹھنے لگے۔ توفیق الٰہی نے اس کا ساتھ دیا اور وہ عقائدِ جبریہ و قدریہ وغیرہ سے تائب ہوگیا۔

ملّا میرو

ملّا میرو کا میدان تنگ وتاز بھی یوسف زئی کا علاقہ تھا۔ عجیب وغریب دعوے کیا کرتا تھا۔ قطب اور غوث سے کم اپنے آپ کو تصور نہیں کرتا تھا۔ ویسے وہ زہد وعبادت اور مجاہدوں کا عادی تھا۔ عین ممکن ہے کہ اسی عالم محویت میں غیب کے کچھ نظارے کئے ہوں جن کی تاب نہ لا کر بھٹک گیا ہو۔ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسے علم غیب میں دسترس ہے۔ اس کے ارادت مندوں میں میاں خان خدر زئی وغیرہ شامل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ رب العزت ایک وسیع مکان میں انسان کی صورت میں متشکل ہو کر تخت پر جلوہ افروز ہے۔ شاید ملّا میرو کو اس شکل میں متشکل ہو کر شیطان نے اپنی صورت دکھائی ہو۔ ان مریدوں کا کہنا تھا کہ ملّا میرو نے براہِ راست دربار خداوندی میں حاضر ہو کر اپنی انسانی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے اور بغیر کسی واسطے کے اسے اس کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل ہے۔

شیخ ابراہیم

یہ بھی اسی طرح کا ایک نام نہاد پیر تھا، اس کے مریدوں کی اکثریت مندانڑ قبیلے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

شیخ میراں صواتی

شیخ میراں صواتی بھی علم غیب کا مدعی تھا اور کہتا

کہتا تھا کہ اللہ تعالےٰ (نعوذ باللہ) اپنی خدائی کے اختیارات و تصرفات مجھے بتلاتا رہتا ہے۔ ملا میرو کے مریدوں نے اپنے مُرشد کی شان میں بہت سے قصیدے اور اشعار لکھ رکھے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ عرش کے اوپر فرش ہے اور اس کے اوپر ایک سخت پتھر ہے۔ اس پر تخت رکھا ہوا ہے اور تخت پر خیمہ تنا ہوا ہے جس کے ستر دروازے ہیں۔ اس خیمہ کے اندر خدا تعالیٰ ہے جس کی خبر ان علماء کو بالکل نہیں ہے۔

خلیل روغانی

ایک اور بدعقیدہ شخص اور بے باک شخص خلیل روغانی تھا وہ اسی طرح کے عقائد باطلہ کا حامل تھا۔

شیخ میاں خان

شیخ میاں خان کے بارے میں اخون درویزہ ؒ لکھتے ہیں کہ ایک بار یوسف زئی لوگوں نے اہل ہزارہ پر لشکر کشی کی تھی، میں خود بھی اس لشکر کے ہمراہ گیا تھا۔ اچانک سخت بارش اور ژالہ باری نے آن گھیرا، طوفان اتنا شدید تھا کہ ہر شخص کو جان کا خطرہ تھا۔ شیخ میاں خان بھی لشکر کے ہمراہ تھا، چونکہ مندان لوگ اسے پیر سمجھ کر اس کی قدر و منزلت کرتے تھے اس لئے وہ فوراً اس کی طرف رجوع ہوئے تو اس نے کہا کہ " اس جنگ میں تمہارے لشکریوں کے ہاتھوں کوئی نہایت برگزیدہ شخص قتل ہو گیا۔ وہ بہت صالح انسان تھا اور ذاکر حقانی تھا۔ اس کے قتل پر اللہ تعالےٰ غضبناک ہو گیا ہے اور اس قدر غصّے میں ہے کہ اس کا تخت ڈولنے لگا ہے۔ اگر میں جلدی پہنچ کر اُسے امداد نہ دیتا تو قریب تھا کہ اللہ تعالےٰ تخت سے گر پڑا ہوتا — میں نے اسے تھام لیا اور ژالہ باری رک گئی — یہ الفاظ لکھ کر اخون درویزہ کہتے ہیں کہ یہ تھا اس عہد کے خود ساختہ پیروں کا حال اور اُن کے نادان معتقدوں کی عقل — اس قسم کے نام نہاد پیشوا — وہ جیسے خود جاہل تھے ان کے ماننے والے بھی ویسے ہی بے علم اور اَن پڑھ لوگ تھے۔

شیخ میرداد خیل

بھی ایک ایسا ہی بر خود غلط انسان تھا۔ عجیب و غریب دعوے کیا کرتا تھا اس کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بہت سے سابقہ کبیرہ گناہ معاف کر دیئے ہیں اور آئندہ بھی معاف کرتا رہے گا۔ یہ شخص ملّا میرو کا استاد تھا۔

جہاں ان دنیا پرست پیروں نے اس قسم کی باتیں پھیلانے کا دھندا اختیار کر رکھا تھا اور وہ شہرت طلبی کے پیشِ نظر ایک سے ایک نرالے دعوے کرتے تھے وہیں عوام کا مذاق بھی سخت بگڑ چکا تھا۔ وہ پیروں سے اسی طرح کی کرامات کی توقع کرتے تھے۔ جنّات کی تسخیر کے دعوے بھی اس دور میں بہت زیادہ تھے۔

پیر بابا علیہ الرّحمۃ نے جہاں لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات پر کاربند رہنے کی ہدایت کی وہیں واشگاف الفاظ میں انہیں سمجھایا کہ مرشد کا اصل کام شرعی احکام کی تبلیغ ہے۔ اسلام ایک عملی دین ہے، قیامت میں ہر مسلمان سے سوال ہوگا تو یہی ہوگا کہ اس نے ارکان و احکام اسلام پر کس حد تک عمل کیا۔ اس لئے عوام کا فرض ہے کہ پیروں سے دُور از کار باتوں اور کرامات کی توقع نہ رکھیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی مسائل سیکھیں جن کی بدولت ان کی دنیا بھی سُدھر سکے اور آخرت میں بھی سرخروئی نصیب ہو۔ اس کے ساتھ ہی پیر بابا مشائخ اور صوفیاء پر بھی زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی کرامات کو حتی الامکان چھپائیں۔ ان کا چرچا نہ کریں تاکہ لوگوں کی توجہ اُن کی کرامات پر مرتکز نہ ہو بلکہ مشائخ پابندئ شریعت کا عملی نمونہ مریدوں کے سامنے پیش کریں اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیں۔

ملّا عمر شلمانی

جہاں تک تسخیرِ جنّات کا ذکر ہے اخون درویزہؒ کہتے ہیں کہ خود میرے مریدوں اور شاگردوں میں سے ملّا عمر شلمانی مرتبۂ غیب جن پر پہنچکر اس قدر مغرور اور متکبّر ہوگیا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ہماری

صحبت سے دور بھاگتا تھا۔ اس نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے ٹوپی کے قریب پر بیٹیاں گاؤں کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اخون درویزہ کو مراقبہ میں اس کے حال کی خبر ہوئی تو اسے اپنے پاس بُلالیا اور اس کی اصلاح پر توجّہ دی۔

مُلّا رکن الدین

یہ شخص اپنی بدعقیدگی میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ بعض معاملات میں الحاد کی حدوں کو چھولیتا تھا۔ ذات باری تعالیٰ کے بارے میں اس کے خیالات بڑے گمراہ کن تھے۔ خود بھی اپنے خیالات کا پرچار کرتا اور اس کے پانچ بیٹے عبداللہ، رحمت اللہ، نعمت اللہ، فیض اللہ اور بایزید بھی پشتو رسائل اور اشعار کے ذریعے لوگوں میں اپنے عقائد پھیلایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک رسالہ مخالفِ طریق مذہب مشائخ متقدمین بھی تصنیف کیا تھا اور اپنی علمیت کا سکہ منوانے کی کوشش کی تھی۔ اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا نعمت اللہ نے خود میرے اساتذہ میں سے ایک کو جس کا نام لطف اللہ بن امام الدین تھا معرفتِ باری کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہرحال یہ غنیمت تھا کہ اس لغزش کا علم ہونے پر ان کے والد امام دین نے انہیں گمراہی سے بچالیا اور وہ پھر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگئے

مُلّا عبدالرحمٰن

یہ شخص ہندوستان سے یہاں وارد ہوا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے زرگر تھا۔ تاہم سیّد کہلاتا تھا۔ وہ انسان کی بعثت ثانی اور احوال قیامت کا منکر تھا۔ بعض دوسرے عقائد میں بھی وہ "پیر تاریک" (بایزید انصاری) کا ہم خیال تھا۔ بارہا اخون درویزہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ عبدالرحمٰن کے مناظرے اور مذاکرے ہوتے۔ اسے ہر بار شرمندگی اور شکست کا سامنا ہوتا تھا۔ خاص طور پر وہ اپنے عقیدوں سے دستبردار بھی ہو جاتا تھا لیکن پھر اپنی ہی روش پر چل پڑتا تھا۔ اصل میں اسے حکمران بننے کا خبط تھا، چونکہ زرگر تھا اس لئے اس نے اپنے نام کا سکہ بھی چلایا تھا جو "میاں شاہی" کے نام سے مشہور تھا۔ جب وہ بادشاہی

حاصل کرنے میں ناکام رہا تو ہزارہ کے مقام مانکرائے میں سکونت پذیر ہوا۔ پڑھا لکھا تھا اس لئے اپنے عقائد کی تشہیر کے لئے ایک رسالہ بھی تحریر کیا جس کا نام حُسنیہ تھا۔

تانی مہمند زئی

تانی مہمند زئی کو ایک طویل عرصہ تک ہندو جوگیوں کی صحبت میں رہنے سہنے کا موقع ملا تھا۔ اس نے جوگیانہ رموز و اسرار سے کافی آگاہی حاصل کر لی تھی۔ وہ عقیدہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور دوسرے بعض ہندوانہ عقائد کی طرف بھی مائل تھا۔ اپنے آپ کو صاحب کمال تصوّر کرتے ہوئے وہ بھی پیر بن بیٹھا تھا۔ اس کا بیٹا اور جانشین بلید بھی اپنے باپ کے مسلک پر کاربند رہا۔ البتہ اس کا پوتا شیخ فرید گاہے گاہے علماء کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا اور اپنے غلط عقیدوں سے دستبردار ہو گیا۔

شیخ یوسف مہمند زئی

شیخ یوسف مہمند زئی بھی اس دور کے پیران تاریک میں سے تھا اور بزعم خود پیر اور پیشوا بنا ہوا تھا۔

سیّد احمد بن میرو

ایک اور برخود غلط شخص سید احمد بن میرو بن ھکو تھا۔ جس کی داستان یوں ہے کہ شیخ حسن نامی ایک شخص نے اجو ننھیال کی جانب سے خشک تھا، ہندوستان سے ایک غلام ھکو نامی فریدا تھا شیخ حسن کی حیات تک تو وہ غلامی کرتا رہا لیکن اس کی وفات کے بعد غلام ہونے کی بجائے اصیل ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس ھکو کے بیٹے میرو نے پیری مریدی کو آسان کام سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو پیر مشہور کر دیا۔ تیسری نسل میں پہنچکر وہ اور تیز ہو گئے اور میرو کا بیٹا سیّد احمد کہلانے لگا۔ ایک بار وہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اور بھیس بدل کر حضرت پیر باباؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کا نام سنا تھا لیکن دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنی مومنانہ فراست

کی بناء پر اُسے پہچان گئے اور اُس سے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ علاقے کے لوگ اس کی بزرگی کو تسلیم کرتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اس لئے وہ فتویٰ لینے (پیر بابا کی) خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ آیا اس کی پیری جائز ہوگی یا نہ؟ اس پر پیر باباؒ نے فرمایا "یہ کام خود سری اور خود روی کا ہے، شیخ کامل کی اجازت اور طویل عرصہ تک ریاضت و عبادت کے بغیر پیری کا دعویٰ کرنا موجب ضلالت ہوتا ہے۔" اس نے پوچھا تو پھر اپنے بارے میں اذن کس سے لوں؟ حضرت پیر باباؒ نے فرمایا "اکناف عالم میں لمبے لمبے سفر کرو۔ اہل اللہ کی تلاش کرو اور جس کسی کو دیکھو کہ ظاہری شریعت کا بھی پابند ہے اور باطنی نور سے بھی معمور ہے اس کی خدمت اختیار کرو۔" یہ سن کر وہ وہاں سے تو چلا گیا لیکن کسی مرشد کی تلاش کی تکلیف گوارا کی اور نہ کسی سے اذن لیا۔ البتہ یونہی مشہور کر دیا کہ "میں حضرت بہاؤ الدین ذکریا علیہ الرحمۃ کی اولاد کی طرف سے ماذون اور مجاز ہوں" اس نے کئی رسالے بھی تصنیف کئے اور پیر بنا رہا۔ اس کا ایک بیٹا سرمست نامی تھا جو اس کا جانشین قرار پایا۔ وہ ہمیشہ رقص و سرود میں مشغول رہتا تھا اور اس شغل کو جائز اور حلال قرار دیتا تھا۔

شیخ فرید

انہی پیرانِ خود ساختہ میں سے ایک فرید بھی تھا جس کا قصہ یوں ہے کہ خواجہ خضر افغانی نے جو جبیلہ نازن سے تھا اپنی ایک کنیز ایک حجام سے بیاہ دی تھی جو موضع بجواڑہ میں رہتا تھا۔ فرید اسی کنیز کا بیٹا تھا۔ کسی قدر تعلیم یافتہ بھی تھا لیکن شومئ قسمت سے ہندو جوگیوں کی ایک جماعت میں شامل ہو گیا اور جہاں گردی اختیار کر لی۔ کافی عرصہ تک ان کے پاس رہنے سے وہ ایک کامل سنیاسی بن گیا۔ جوگیانہ خیالات سے متاثر ہونے کے علاوہ وہ عقیدہ تناسخ کا بھی قائل تھا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ کچھ عرصہ تک بادشاہ شیر شاہ سوری کے فرزند سلیم شاہ کے محافظ دستہ میں بھی رہا۔ جب سلیم شاہ کی حکومت جاتی رہی تو

علاقہ یوسف زئی میں آ گیا اور یہاں پہنچتے ہی اپنے آپ کو "حاجی محمد" کے نام سے موسوم کر کے پیری مریدی کا دھندا اختیار کر لیا۔ ساتھ ہی یہ بھی مشہور کیا کہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی اولاد میں سے ایک شخص میر فیض اللہ ولی کا ماذون اور مجاز ہوں۔ ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا کہ میری عمر تین سو سال ہے اور میں نے سات حج کئے ہیں۔ اخون درویزہ بابا رحؒ کا کہنا ہے کہ ہم نے یہ دعوے سُنے تو ایک شخص کو حقیقت حال معلوم کرنے اس کے پاس بھیجا۔ جب اس مردِ دانا نے اس سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ جھلّا کر کہنے لگا۔ میں نے مدینہ منورہ بہت ہی چھوٹی عمر میں دیکھا تھا اب پوری طرح یاد نہیں۔ اس پر اس کے سات حجوں کی قلعی کھل گئی۔ جب اس کے سلسلۂ طریقت کے بارے میں پرسش کی گئی تو وہ سرزمین یوسف زئی کو چھوڑ کر غوریا خیل افغانوں کے علاقہ کو کوچ کر گیا۔ اصل میں اس شخص کے بہت سے مرید ہو گئے تھے اس لئے اس کے دماغ میں اپنی بادشاہت قائم کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا۔

حاجی عمر

حاجی عمر غوریا خیل بھی ایک نام نہاد پیر تھا۔ غلط عقائد اس کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ اخون درویزہؒ اس کے پاس گئے اور وعظ و نصیحت کی۔ جس پر وہ اپنی خطاؤں کا قائل ہو کر ان کے ہاتھ پر تائب ہو گیا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد پھر چند پرانے عقائد اختیار کر لئے۔

زڑی جان

افغانوں کا ایک اور پیر خواجہ زڑی جان تھا، وہ تارک صوم و صلوٰۃ اور آزاد منش انسان تھا، دوسروں کو بھی آزادروی کا سبق دیتا تھا، جبریہ مذہب کا پابند تھا چونکہ وہ شرعی پابندیوں پر زیادہ زور نہیں دیتا تھا اس لئے اس کے گرد ان پڑھ عوام کی بڑی جمعیت جمع ہو گئی تھی۔

شاہ اسمٰعیل۔ میر علی۔ ابوبکر اور عمر : یہ چاروں شخص قندہار کے ایک جوہر

کی اولاد سے تھے جس نے دعویٰ کیا تھا کہ میری اولاد سے اولیاء اللہ پیدا ہوں گے یہ لوگ زھد و عبادت اور عملیات نو مجاہدات کی بدولت جنّات کی تسخیر میں بھی کسی حد تک حاصل کر چکے تھے، ان کی محفلوں میں رقص و سرود کا اہتمام ہوتا تھا وہ اپنے اوپر حالتِ جذب طاری کر لیتے اور غیب کی باتیں بنایا کرتے تھے۔ اغلب خیال ہے کہ ان کے علم موجودہ مسمریزم وغیرہ سے ملتا جلتا تھا۔ خٹک قوم کے افراد ان کے بہت گرویدہ تھے۔

شیخ قاسم غوریا خیل

اس شخص نے پشاور میں ایک درخت کے نیچے ڈیرا لگا رکھا تھا۔ قلندرانہ زندگی گذارتا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگ اس کی طرف مائل ہونے لگے تو اس نے کئی بدعتیں اور عجیب و غریب حرکتیں شروع کر دیں جس پر شادمان خان نے جو میرزا حکیم (فرزند شہنشاہ ہمایوں) کی جانب سے علاقے کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس کے قتل کا حکم دیا۔ اس پر یہ شخص راتوں رات بھاگ نکلا اور قندہار پہنچ کر عازمین حج کی ایک جماعت میں شامل ہو گیا۔ جب مکہ مکرمہ سے واپس آیا تو اعلان کر دیا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی اولاد سے اذن و اجازت لے کر آیا ہوں۔ حالانکہ اس دعوے میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ بات صرف اس نے اپنی پیری مریدی کی دکان چمکانے کے لئے مشہور کر دی تھی۔

متذکرہ بالا لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے جعلی پیر اس علاقے میں موجود تھے۔ جن کے زیر اثر مسلمان عوام اسلام کے بنیادی عقائد اور اعمال پر توجہ دیتے نہ تھے البتہ ان خود غرضوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حضرت پیر بابا اور ان کے ساتھیوں کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انہوں نے ان سرحدی علاقوں میں دسویں صدی ہجری میں پھیلی ہوئی ان خرابیوں کا سدباب کیا، لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کو صحیح صورت

میں پیش کیا۔ ان حضرات کی کوششوں سے معاشرے سے تاریکیاں ختم ہوئیں اور اسلام کے نور سے چاروں طرف اُجالا ہو گیا۔ پیر بابا علیہ الرحمۃ کے مشن کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج چار سو سال گذر جانے پر بھی ان علاقوں کے لوگ نماز روزہ اور احکام شرعیہ کے پابند اور مسلک حنفی کے پیروکار ہیں۔ گویا سرزمین یوسف زئی میں حضرت پیر باباؒ کی آمد یہاں کے لوگوں کی بڑی خوش قسمتی اور سعادت مندی تھی۔ صدیاں گذر جانے پر بھی ان حضرات کرام کی برکات اسی طرح قائم و دائم ہیں، لوگ اُن کا نام احترام سے لیتے ہیں اور ان کی اولاد کی دل و جان سے عزت کرتے ہیں۔ رات دن پیر بابا کی آخری آرام گاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے، لوگ وہاں جا کر سابقہ گناہوں سے توبہ کرتے اور آئندہ محتاط اور شرع محمدی کے عین مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اللہ والوں کی بہار کے تئے خزاں نہیں اور ان پر ہمیشہ یہ شعر صادر آتا ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۶

پیرِ روشن یا پیرِ تاریک؟

یوں تو حضرت پیر باباؒ سید علی ترمذی، اخون درویزہؒ اور ان کے ارادت مندوں کو بہت سے بد عقیدہ مدعیانِ ولایت سے مقابلے اور مناظرے کرنے پڑے تاہم ان کے یادگار معرکے وہ تھے جو بایزید انصاری اور ان کے ساتھیوں سے ہوئے۔

بایزید انصاری اس دور کی ایک بڑی پراسرار شخصیت تھا، اپنے مخالفین میں وہ "پیرِ تاریک" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جبکہ اس کے حامی انہیں "پیرِ روشن" سمجھتے تھے۔ مختلف لوگوں نے اس کا جو محاکمہ کیا وہ بڑا دلچسپ ہے، پیر باباؒ اور اخون درویزہ کے نزدیک بایزید انصاری ملحدانہ خیالات کا پرچارک تھا۔ لیکن بایزید کے ارادت منداس کے اشارۂ ابرو پر جان تک دینے کو تیار رہتے تھے۔

جہاں تک بایزید انصاری کے حالاتِ زندگی کا تعلق ہے۔ وہ وزیرستان کے مقام کانی گرام کے اُرمڑ قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد کا نام قاضی عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ تھا۔ قاضی عبداللہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ اُن کا خاندان گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا آنا جانا ہندوستان کے کئی شہروں میں بھی ہوتا تھا۔ بایزید کے ننھیال کا قیام جالندھر میں تھا۔ وہ وہیں پیدا ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ بایزید اُن دنوں پیدا ہوا جب بابر نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس طرح اس کا سالِ ولادت ۱۵۲۵ء یا ۱۵۲۶ء بنتا ہے۔ اپنی خاندانی روش کے مطابق بایزید

سنے بھی مروّجہ دینی تعلیم حاصل کی۔

کہا جاتا ہے کہ قاضی عبداللہ کا سلوک اپنی بیوی (بایزید کی والدہ) سے اچھا نہ تھا اور بعد میں اغلباً اس نے اُسے طلاق بھی دے دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بایزید اپنی تحریروں میں باپ کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کرتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے مروّجہ علوم اسلامی کی تعلیم دلا کر اعلیٰ پایہ کا عالم و قاضی بنانا چاہتا تھا جبکہ بایزید طبعاً مجاہدوں، مراقبوں، گوشہ نشینی اور چلہ کشی کی طرف مائل تھا۔ باپ کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ مروّجہ سلسلہ ہائے طریقت (نقشبندیہ، سہروردیہ، چشتیہ، قادریہ) کے کسی شیخ سے بیعت کرے جبکہ بایزید اپنے ہی خیال کے مطابق کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں سرگردان رہتا تھا۔

"صراط التوحید" بایزید کی مشہور تصنیف ہے، جس سے اس کے عقائد پہ روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں وہ مرشدِ کامل کا متلاشی تو رہتا ہے لیکن آخر تک مطلوبہ مرشدِ کامل کو پا نہیں سکتا۔ بالآخر (بقول اس کے) اُسے خواب میں خواجہ خضر علیہ السلام کا دیدار ہوتا ہے جنکی بدولت وہ روحانی مدارج طے کرتا ہے۔ بایزید انصاری کے نزدیک سلوک کی آٹھ منزلیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت ہیں۔

اپنی خودنوشت میں بایزید انصاری بتاتا ہے کہ وہ مدتوں پیرِ کامل کی تلاش میں سرگردان رہا یہاں تک کہ اس کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔ وہ پانچ سال تک گوشۂ تنہائی میں مقیم رہا۔ اسی دوران اس نے "صراط التوحید" لکھی۔ بعد میں اس کی روحانیت کا شہرہ ہوا تو دور و نزدیک سے لوگ آکر مرید ہونے لگے۔ پہلے اُس نے کانی گرام (وزیرستان) میں تبلیغ کی پھر ننگرہار اور علاقہ مہمند کا دورہ کیا۔ اس سفر کے دوران وہ علاقہ بنگش، علاقہ اورک زئی اور تیراہ بھی گیا اور پشاور اور ہشت نگر کے لوگوں کے سامنے بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ کچھ عرصہ وہ مردان کے نواح میں بھی مقیم رہا۔ رفتہ رفتہ کچھ علماء نے بھی بایزید کی حمایت شروع کر دی جن میں مشہور شاعر ملّا ارزانی، ملا عمر، ملا علی محمد مخلص، ملّا میرو، ملّا پائندہ، ملا دولت

اکوزئی اور ملاّ دولت محمد زئی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ملا ارزانی تو کچھ دیر بعد اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جبکہ دوسرے لوگ اس کے دامن سے وابستہ رہے ۔

بایزید انصاری قبیلہ محمد زئی میں مقیم تھا تو چند سرکردہ خوانین بھی اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جن میں دو اشخاص بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ ایک کا نام پائندہ خان تھا دوسرے کا نام بہار خان، بایزید نے باہمی تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی بی بی کمالہ کا عقد پائندہ خان کے بیٹے علی خان سے کر دیا اور اپنے بیٹے عمر کی شادی بہار خان کی بیٹی سے کر دی۔ اسی طرح اس نے اپنے دوسرے بیٹے جلال الدین (جلالہ) کا نکاح بھی محمد زئی کے ایک سرکردہ خان محمد خان کی بیٹی سے کر دیا اور خود بھی ہشتنغر کی ایک خاتون ذکی سے بیاہ رچا لیا۔ بایزید کا ایک اور مقتدر خلیفہ مودود دی ریا دائی تھا جو بلوچستان، سندھ اور قلات تک گیا اور ہر جگہ لوگوں کو اپنا حامی بنانے میں کوشاں رہا ۔

اسی طرح بایزید نے اپنے ایک اور خلیفہ ملاّ دولت کو اکبر بادشاہ کے ہاں بھی بھیجا۔ اکبر نے بایزید انصاری کے عقائد پر کوئی تنقید یا مخالفت نہ کی بلکہ اُسے ایک روحانی رہنما سمجھتے ہوئے اس کا بظاہر احترام کیا۔ تاہم بایزید انصاری اور مغل حکمرانوں کے مابین تعلقات کی یہ خوشگواری زیادہ دیر تک قائم رہنے نہ پائی اور حالات نے ایسی کروٹ اختیار کی کہ بایزید کی مذہبی جماعت ایک سیاسی جماعت میں تبدیل ہو کر رہ گئی ۔

مغلوں سے بایزید انصاری کی مخالفت اور مناقشت کا آغاز یوں ہوا کہ اس کے کئی مرید بہت متشدّد اور انتہا پسند تھے۔ وہ ہر وقت ذکر و فکر میں لگے رہتے اور کسی شخص کی دنیوی وجاہت کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے، یہ مجذوب اور مست ملنگ قسم کے لوگ تھے ایک دفعہ ہندوستان سے سوداگروں کا ایک قافلہ کابل جا رہا تھا۔ کسی بات پر اہل قافلہ کا جھگڑا ان بایزیدی مجذوبوں سے ہو گیا۔ مجذوبوں نے نہ صرف انہیں مارا پیٹا بلکہ ان کا مال و اسباب بھی چھین لیا۔ کابل پہنچنے پر ان سوداگروں نے اس واقعہ کی شکایت والئ کابل حکیم میرزا ،

(اکبر بادشاہ کے سوتیلے بھائی) سے کی۔ انہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ بایزید انصاری مغلوں کا جانی دشمن ہے۔ اُس کا رسوخ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں بڑھ رہا ہے اور لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اگر بر وقت ان کا مواخذہ نہ کیا گیا تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اس پر حکیم میرزا نے پشاور کے قلعہ دار معصوم خان کو ہدایت کی کہ بایزید کو گرفتار کر کے کابل بھیجا جائے۔ اتفاق سے جس وقت میرزا حکیم کا یہ پیغام حاکم پشاور کے پاس پہنچا، بایزید کا مقرب مرید پائندہ خان ہشنغری بھی وہیں دربار میں موجود تھا۔ اس نے فوراً بایزید کے پاس آدمی دوڑا یا کہ جلدی سے وہاں سے کوچ کر جائے۔ اس پر بایزید اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر علاقہ مہمند کو نکل گیا اور پھر خیبر، تیراہ، اور علاقہ بنگش میں پہنچ کر اپنے ارادت مندوں کو مغلوں کے خلاف اکساتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان علاقوں کے لوگ مغلوں کے خلاف مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہ مخاصمت اتنی بڑھی کہ ایک بار اکبر کا ایک فوجی افسر میرزا سلیمان درہ خیبر سے گزر رہا تھا کہ آفریدیوں نے حملہ کر کے اس کا مال و متاع لوٹ لیا۔ یہ خبر پشاور پہنچی تو پشاور کے مغل حاکم نے تیراہ پر ہلہ بول دیا۔ اورکزئی اور تیراہی آفریدیوں نے شاہی لشکر کو بھاری نقصان پہنچایا۔ کافی تعداد میں مغل سپاہی مارے گئے۔ جس پر دہلی دربار کی جانب سے راجہ مان سنگھ کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ جب کابل کے مغل صوبہ دار نے بایزید انصاری کے خلاف مہم بھیجی تو اخون درویزہ کے حامیوں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ دس سال کے قریب دونوں فریقوں میں مختلف مقامات پر لڑائیاں ہوئیں بالآخر بایزید کو گرفتار کر کے کابل میں قید کر دیا گیا۔ جب کسی نہ کسی طرح وہ کابل کی قید سے چھوٹا تو سیدھا ننگرہار پہنچا۔ اب کے اس نے اپنا مرکز اعلیٰ تیراہ کو بنایا اور مغلوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مغل صوبہ دار محسن خان نے تیراہ پر چڑھائی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس طرح تیراہ کے سارے علاقے پر بایزید انصاری کا مکمل تسلط ہو گیا۔ جہاں مغلوں کو ان معرکوں میں بھاری جانی نقصان برداشت کرنا پڑا وہیں بایزید انصاری

کے تھیں، سوا تین سو عقیدتمند بھی لڑائیوں میں کام آئے۔

ان کامیابیوں سے بایزید انصاری کے حوصلے اتنے بڑھے کہ اس نے بہت سا لشکر جمع کر کے ننگرہار کے راستے کابل پر ہلہ بول دیا۔ شنواریوں کے علاقہ میں توراغہ کے مقام پر دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر بایزید کی فوجوں کو پسپائی کا سامنا ہوا اور وہ خود بھی مارا گیا۔ اس کی وفات کے بارے میں دو مختلف روایتیں ہیں، پہلی یہ کہ بایزید صوبہ دار محسن خان کے ہاتھوں قتل ہوا اور اُسے ہشتنگر میں دفن کیا گیا اور دوسری یہ کہ توراغہ کی شکست کے بعد وہ گرمی اور پیاس کی شدت سے جاں بحق ہوا اور اُسے کلپانی کے قریب دفن کیا گیا لیکن بعد میں ان کے وارث تابوت نکال کر لے گئے اور تبرکاً اپنے ساتھ پھراتے رہے۔ بایزید کی وفات ۹۹۲ ہجری میں واقع ہوئی۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر نے "تذکرۃ الانصار" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بایزید انصاری کے پانچ بیٹے تھے۔ شیخ عمر، کمال الدین، شیخ نورالدین، شیخ خیرالدین اور شیخ جلال الدین۔ ان میں سے شیخ عمر باپ کا جانشین قرار پایا۔ شیخ عمر نے اپنی مُہم کو مزید تیز کیا اور مردان اور ہشتنغر سے بہت سے لوگوں کو ساتھ ملا لیا۔ دوسری طرف یوسف زئی لوگ اختلاف عقائد کی بنا پر شیخ عمر اور اس کے ساتھیوں کی مخالفت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یوسف زئی اور شیخ عمر کے حامیوں کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ پہلا معرکہ سرکانے میں ہوا۔ جس میں شیخ عمر انصاری کا پلہ بھاری رہا۔ یہ لوگ اکوزئی کے بہت سے مویشی بھگا لے گئے۔ دوسرا معرکہ مینئی میں ہوا۔ اس میں بھی میدان شیخ عمر کے ساتھ رہا۔ جبکہ تیسرا اور آخری فیصلہ کن معرکہ دریائے سندھ کے کنارے ٹوپی کے قریب باڑہ تنتول کے مقام پر پیش آیا۔ جس میں حمزہ خان اکوزئی (یوسف زئی) کو فتح کامل نصیب ہوئی۔ شیخ عمر اور اس کا بھائی خیرالدین لڑائی میں مارے گئے۔ نورالدین محمد زئی کے پاس پناہ کا طالب ہوا لیکن کسی نے موقع پا کر دہیں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بایزید کے پیرکار ہر وقت اُس کے تابوت کو ساتھ لئے پھرتے تھے۔ لیکن اس جنگ کے بعد جب انہوں نے اپنے

آپ کو بے یار و مددگار دیکھا تو تابوت توڑ کر اس کی لاش کو دریائے سندھ کی لہروں کی نذر کر دیا۔

مقامی روایات کے مطابق بایزید انصاری کا بیٹا موضع جھنڈا اور مینئی کے درمیان مارا گیا تھا۔ اس جگہ کو اب بھی جلالی درّہ کہا جاتا ہے۔ یوسف زئی نے فتح کی یادگار کے طور اس جگہ ایک جھنڈا گاڑ دیا تھا بعد میں اس مقام پر کچھ مکان بن گئے تو گاؤں کا نام بھی "جھنڈا" پڑ گیا۔ ۱۸۸۷ء تک یہاں صرف چودہ مکان تھے جو پینے کا پانی چار میل دور سے لایا کرتے تھے۔

بایزید انصاری کے باقی بیٹے تو لڑائیوں میں کام آئے لیکن سب سے چھوٹا بیٹا جلال الدین عرف جلالہ بچ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف زئی سے جنگ کے بعد وہ زخمی ہو کر دریائے سندھ میں کود گیا تھا۔ شکیزے پر دریا پار کرنے کے بعد قبیلہ امان زئی سے پناہ کا طالب ہوا چونکہ وہ نہایت ہی شکیل و وجیہہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے اُسے قتل کرنے سے دریغ کیا البتہ اسے گرفتار کر کے قلعہ اٹک میں شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کر دیا۔ شہنشاہ اکبر بھی اس کی مسحور کن شخصیت سے بڑا متاثر ہوا اور اس سے عزّت و احترام سے پیش آیا۔ تاہم موقع ملتے ہی جلال الدین قید سے بھاگ نکلا اور تیراہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تیراہ پہنچتے ہی بہت بڑا لشکر جمع کیا اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ غزنی کا مغل حاکم اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ نکلا جس پر جلال الدین انصاری کے حکم پر اس کے ساتھیوں نے غزنی کو تاخت و تاراج کیا اور بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انصاری کا لشکر غزنی سے واپس آرہا تھا کہ ہزارہ قبائل کے جنگ آزماؤں پر ٹوٹ پڑے۔ جلال الدین لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس کا سر کابل کے مغل گورنر کو بھیجا گیا جبکہ دھڑ کے دو ٹکڑے کر کے ایک کو شہر کے ایک دروازے پر اور دوسرے کو دوسرے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ ۱۵۸۵ء سے ۸۷ھ تک جلال الدین انصاری آفریدی اور اورکزئی لڑاکوں کی مدد سے علی مسجد، جمرود اور تیراہ کے

مختلف مقامات پر مغل فوجوں کے خلاف دادِ شجاعت دیتا رہا۔ البتہ تیراہ کی ایک جنگ میں اُسے نقصان اٹھانا پڑا اور اس کے بہت سے ساتھی قیدی بنا لئے گئے تو وہ بھاگ کر کافرستان چلا گیا اور وہاں سے واپسی پر فوت ہو گیا۔

اُدھر اکبر بادشاہ کی موت پر جہانگیر نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس نے ۱۶۰۷ء میں کابل جاتے وقت شاہ بیگ کوجی (فاتح قندہار) کو "خانِ دوران" کا خطاب دے کر تاریکیوں یا روشنائیوں سے نپٹنے کا حکم دیا۔ اس وقت جلالہ کی موت کے بعد اس کا بھتیجا عبدالواحد یا احداد اپنے فرقہ کا سربراہ تھا۔ اس کی شادی جلالہ کی بیٹی بی بی علائی سے ہوئی تھی جو نہ صرف حسن و جمال میں بلکہ فہم و تدبر اور جرأت و عزیمت میں بھی اپنے دور کی عظیم خاتون تھی۔ شاہ بیگ نے احداد کے خلاف کئی فوجی مہمیں بھیجیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۶۲۰ء میں مہابت خان کو پشاور اور کابل کا گورنر بنایا گیا جس نے جنگ کی بجائے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے روشنائیہ فرقے کے تمام سرکردہ افراد کے اعزاز میں کوہاٹ میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب یہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو شاہی لشکری ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں چن چن کر قتل کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مقتولوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی تھی۔ الفاری سربراہ احداد ان دنوں تیراہ کی وادیٔ مستورہ کے دورے پر تھا اس لئے قتل ہونے سے بچ گیا۔ مہابت خان نے اس کی گرفتاری اور سرکوبی کے لئے غیرت خان نامی ایک سردار کی قیادت میں ایک مہم بھیجی لیکن غیرت خان کو اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تیراہیوں نے سخت مقابلہ کیا جس میں غیرت خان اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

بہر حال مغلوں نے روشنائیوں کے خلاف کوششیں جاری رکھیں۔ چھ برس بعد (۱۶۲۶ء میں) ایک اور مغل لشکر مظفر خان کی قیادت میں ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ اب کے بھی سخت مقابلہ ہوا جس میں احداد مارا گیا اور اس کی مہرِ سیاست اور عصا جہانگیر کو اس وقت پیش کیا گیا جب وہ کابل جاتے ہوئے درہ خیبر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ تاہم

احداد کی موت پر بھی "روشنائیوں" کی سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں۔ اس کے مرتے ہی بی بی علائی خود میدان میں آگئی اور اس نے اپنے نوعمر بیٹے عبدالقادر کو اپنے فرقے کا سردار بنا دیا۔

شاہ جہان بادشاہ کے دور میں بھی بایزید انصاری کے پیروکاروں نے مغلوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے رکھا۔ بی بی علائی خود گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی اور لڑاکوں کی کمان کرتی۔ اس تحریک نے پھر سے کافی طاقت پکڑ لی۔ ایک بار مغل لشکر ایک مہم پر مظفر خان کی قیادت میں پشاور سے کابل جا رہا تھا کہ درہ خیبر میں اچانک ہزاروں آفریدی اور اورکزئی نعرے لگاتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ سے نکلے اور مغلوں کو گھیرے میں لے لیا۔ شاہی لشکر کو بڑا نقصان پہنچا یہاں تک کہ خود مظفر خان کے حرم کی خواتین بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ صرف اس کی ایک بیوی کو سید خان، حاکم کوہاٹ نے بہت سا زرِ فدیہ دے کر روشنائیوں سے چھڑایا۔

اس کامیابی سے بایزید انصاری کے خیبری عقیدت مندوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ انہوں نے دریائے باڑہ کے قریب الم گودڑ کے مقام پر تمام آفریدی لڑاکوں کو جمع کیا اور پشاور شہر پر حملہ کر دیا۔ مغل حکام نے بمشکل تمام قلعہ بالا حصار میں پناہ لے کر جانیں بچائیں۔ تاہم آفریدیوں نے شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ جب اس حملے کی اطلاع مغلوں کے حاکم کوہاٹ سید خان کو ملی تو وہ فوراً مغلیہ فوج کو کمک پہنچانے کے لئے پشاور کو چل پڑا۔ درۂ کوہاٹ میں اس کا سامنا قبائلی لشکر سے ہوا۔ تاہم اس وقت قبائلی لشکر کے سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اس لئے وہ متحد ہو کر نہ لڑ سکے اور مغلوں کو آگے بڑھنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ سید خان نے پشاور پہنچ کر قبائلی لشکر پر کاری ضرب لگائی جس سے "روشنائیہ" لشکر تتر بتر ہو کر رہ گیا اور مغل اقتدار کو پھر سے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

سید خان نہ صرف جنگی امور کا ماہر تھا بلکہ سیاسی داؤ پیچ بھی خوب جانتا تھا۔ اس نے بی بی علائی سے نامہ و پیام جاری رکھا۔ وہ بھی دل میں سمجھ چکی تھی کہ آپس کی ناچاقی کی وجہ سے مغلوں کا مزید مقابلہ کرنا اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے اس نے بھی مصلحت اسی

میں سمجھی کہ مغل دربار سے کسی باعزت سمجھوتے کی صورت نکل آئے۔ مذاکرات کے نتیجے میں بی بی علائی اور اس کا بیٹا عبدالقادر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئے۔ اس صلح کے تھوڑے عرصہ بعد عبدالقادر تو مختصر علالت کے بعد راہی ملک عدم ہوا البتہ بی بی علائی اپنے ایک بھائی رشید خان کے ساتھ دہلی میں مغل شہنشاہ شاہجہان کے حضور پیش کی گئی۔ شاہجہان نے اسے فرخ آباد (یو، پی) میں بہت بڑی جاگیر عطا کر دی۔ جس پر یہ گھرانا سکون کی زندگی گزارنے لگا، ۱۷۴۷ء میں رشید خان کے فوت ہونے پر روشنائیہ تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں اور بایزید انصاری کی اس کشمکش کے بارے میں لوگوں کی مختلف آرار ہیں۔ کئی تو اسے سیاسی رنگ دیتے ہیں اور بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں کو ایک قومی لیڈر کا درجہ دیتے ہیں جبکہ باقی لوگوں کی نظر میں پیر باباؒ یا اخون درویزہؒ، حمزہ خان اکوزئی یا مغلوں کی جانب سے بایزید انصاری یا پیر روشن اور اس کے ہم خیال لوگوں کی مخالفت کی بنیاد محض مذہبی عقائد کا اختلاف تھا۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اختلاف رائے کا ہونا قدرتی امر ہے علماء اور صلحاء کسی مسئلے یا کسی عقیدہ و عمل پر اختلاف محض اجتہادی اختلاف ہوتا ہے۔ ایسے اختلاف میں دنیوی مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں نہ ذاتی عناد۔ ایک ہی مسئلے یا ایک ہی حقیقت کی توجیہات مختلف لوگوں کے ہاں مختلف ہوتی ہیں، بسا اوقات ایسی مخالفت میں شدت بھی آجاتی ہے اور مبالغہ یا انتہا پسندی بھی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لئے اخون درویزہ اور پیر بایزید کے معرکوں میں بھی کہیں کہیں گرماگرمی اور انتہا پسندی ضرور ہو گی۔ قارئین کو اس پر پریشان ہونے یا معترض ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے۔

ان اختلافی آرار کا محاکمہ کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ اخون درویزہؒ یا بایزید انصاری کسی کے نزدیک کتنے ہی قابل احترام کیوں نہ ہو۔ خطا اور غلطی سے مبرا

نہیں ہو سکتے۔ وہ بہر حال انسان ہیں۔ مرکب من الخطا والنسیان ہیں۔ جوش اور جذبہ کس انسان میں نہیں ہوتا اور جذبات میں کبھی کبھی شدت کا اظہار قدرتی بات ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی "القول الجمیل" میں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں مُرشد کو چاہیئے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے، صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ اس سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ سے صغیرہ گناہوں کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لہذا عوام کے ذہن میں مرشد کے مافوق الفطرت ہستی ہونے کا جو مبالغہ آمیز تخیل قائم ہو گیا ہے۔ اس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ شیخ اوّل تو درجۂ اوّل کے ہیں ہی کیا...... اور پھر بالفرض وہ کامل سے کامل ہوں، جب بھی بہر حال معصوم نہیں ہو سکتے۔ مرتبہ عصمت و معصومیت صرف انبیائے کرام ؑ کے لئے مخصوص ہے۔ شیخ غلطیاں بھی کرے گا اور عین ممکن ہے اس سے اجتہادی غلطیاں کثرت سے سرزد ہوں۔ دائرہ طریقت و شریعت کے اندر بھی وہ ہر خطاء اور لغزش سے محفوظ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر مُصلح یا شیخ خلاف شرع حرکات کا سختی سے محاسبہ نہ کریں تو آخر خرابیوں اور بدعقیدگیوں کا سدباب کیسے ہو؟

اسی طرح ہر کام میں زمان و مکان کے تقاضے بھی ملحوظ رہنے چاہئیں.... "پیر بابا" اور بایزید انصاری کا دَور آج کا آزاد خیالی کا دَور نہ تھا..... آج گھر گھر میں ٹیلی ویژن سیٹ اور ریڈیو سیٹ موجود ہیں۔ اس لئے انسان چاہے تو بھی گانے بجانے اور موسیقی سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن اگر چار سو سال پیشتر کوئی شخص مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے موسیقی کو جائز قرار دیتا تو دوسروں کا اُس پر معترض ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اسی طرح سولہویں صدی کے دقیانوسی ماحول کے پٹھان معاشرے میں گھوڑے پر سوار ایک جوان اور خوبرو عورت کا لشکر کی کمان سنبھالنا عام مسلمان کو کب گوارا ہو سکتا تھا؟ اس لئے اگر بایزید انصاری کے خیالات اور طرزِ عمل پر کسی حلقے سے گرفت ہوئی تو یہ

کوئی نرالی اور انوکھی بات ہرگز نہ تھی۔ جو شخص بھی کسی مسلمہ روایت سے بغاوت کرتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے اس پر اعتراضات کا وارد ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

"حالنامے" سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں پیر بایزید کے مخالفین جو اعتراضات کرتے تھے وہ یہ تھے:۔

۱۔ بایزید نے علم حاصل نہیں کیا، پیر نہیں رکھتا اور چند کلمے نامشروع کہتا ہے۔

۲۔ وہ اپنے آپ کو ہادی اور رہنما کہتا ہے۔

۳۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔

۴۔ اس کا کہنا ہے کہ خلق منافق ہے۔

۵۔ وہ اپنے باپ تک کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔

"حالنامے" ہی سے اُن جوابات کا بھی پتہ چلتا ہے جو اُن اعتراضات کے جواب میں بایزید انصاری نے مولانا زکریا کو دیئے۔ اُس نے کہا "میرے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مجھے انہی کے طفیل سے معرفتِ ذات اور علم توحید حاصل ہوا۔

الہام کے بارے میں اُس نے کہا کہ "خدا نے قرآن مجید میں کہیں نہیں کہا کہ فلاں پر وحی بھیجتا ہوں اور فلاں فلاں پر نہیں۔ بلکہ قرآن مجید میں ہے ینزل الملائکۃ والروح مِنْ اَمْرِہٖ الیٰ مَن یشاءُ" مسلمانوں کو منافق کہنے کے بارے میں بایزید نے کہا "میں مسلمانوں کو منافق نہیں کہتا اگر وہ قرآن و حدیث پر عمل کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ جوابات مسلمان عوام کی تسلی نہیں کرا سکتے تھے۔ خصوصاً سلسلۂ وحی کے بارے میں اس کا یہ کہنا تو بالکل ہی عام سمجھ سے باہر ہے کہ..... "نہیں! لوگ میرے متعلق یہ بات غلط کہتے ہیں، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے الہام سے میرے دل پہ کتاب نازل کی ہے۔ اس کا نام "خیر البیان" ہے۔ اس میں چالیس بیان ہیں..... لیکن عوام الناس وحی اور الہام میں فرق نہیں کر سکتے، اس لئے وحی کہتے ہیں"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے بایزید ہر اعتراض کا گول مول جواب دے کر ٹال دیا کرتا تھا۔

بایزید انصاری کو "پیر روشن" اس لئے کہا جاتا تھا کہ اپنی کتاب "صراط التوحید" میں اس نے لکھا تھا کہ "اگر چاہو تو میں تبلادوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے لوگ کن کن تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آئیں گے...... (۱) تاریکیٔ کفر سے ایمان کی روشنی کی طرف (۲) شرک و نفاق کی تاریکی سے توحید و خلوص کی روشنی کی طرف (۳) بدعت و معصیت کی تاریکی سے سنت وا طاعت کی روشنی (۴) باہمی اختلافات کی روشنی سے نکل کر اسلامی وحدت کی روشنی کیطرف (۵) اور بدخوئی اور تنگ دلی کی تاریکی سے نکل کر نیک خوئی کی طرف"۔..... تاہم اسی صراط التوحید کے مطالعہ سے اس کے دعووں کی قلعی اس طرح کھل جاتی ہے کہ وہ بار بار اپنے باپ قاضی عبداللہ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ خضر علیہ السلام سے ملاقات کا دعویدار ہے۔ جگہ جگہ مرشدِ کامل کی تلاش کا ادعا کرتا ہے لیکن آخر تک مرشد کامل سے محروم رہتا ہے اس بات کا مدعی ہے کہ بچپن ہی میں اسم الیقین تک اور پھر جوانی میں علم الیقین سے عین الیقین تک پہنچ گیا تھا۔ تاہم اس کا یہ دعویٰ صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے۔ اصل صورت یہ ہے کہ آخر میں وہ صرف اور صرف دنیوی اور سیاسی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوگیا اور اسی حال میں دنیا سے چل بسا۔ اس کا کہنا تھا "میرا خیال ہے کہ جملہ وزارتِ عالم خدا تعالیٰ کی ہستی سے جدا شے نہیں"۔... غور سے دیکھا جائے تو یہ الفاظ عقیدۂ حلول کی نشان دہی کرتے ہیں۔

وہ اپنے بارے میں دعویٰ کرتا ہے کہ "اوھر وجود کی ہستی کو خدا تعالیٰ کی ہستی کے ساتھ یک وجود کر کے دکھلا رہی تھی"۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے "جمعہ کی رات کو اس جگہ جا کر شہر سے باہر تنہائی میں "اسم اعظم" کا ورد شروع کیا۔ مگر بعض دوستوں نے وہاں سے اُٹھ آنے پہ مجبور کیا"۔ وہ اسم اعظم کیا تھا؟ اس کا ذکر بایزید کی کسی تحریر میں نہیں"۔

اسی طرح بایزید انصاری کا کہنا ہے۔" بعد میں مجھے خواب میں اور بیداری میں کہا گیا کہ جو تجھ سے فائدہ لینے آئے اس کو توحید کی راہ بتلایا کر اور سب کو شرکِ خفی سے نکال"۔ وہ توحید کیا تھی اور شرکِ خفی سے نکالنے کا طریقِ کار کیا تھا؟ یہ وہ سربستہ راز ہے جو بایزید کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔

سید عبدالجبار شاہ اپنی خود نوشت میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ شخص (بایزید) عجیب پراسرار شخص تھا۔ اپنے مریدوں کے حلقہ میں بسا اوقات" نبی" ہونے کا دعویٰ بھی کردیا کرتا تھا اور کم مایہ اور کم پایہ علماء سے اس چالاکی سے بحث کرتا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہوکر اسلام کے بنیادی عقائد سے بدظن ہوکر اباحتی بن جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اصل میں اپنی نئی شریعت رائج کرنے کے درپے تھا۔ حلولِ خدائی کا قائل تھا اور خود کو اوتار اور نبی بھی کہتا تھا"۔

جب ایک بار اُسے قیدی بنا کر شہر کابل لے جایا گیا تو وہاں اپنے معتقدات باطلہ سے بالکل انکاری ہوگیا۔ قید خانے میں زہد و ریاضت پر بڑا زور دیا جس کی وجہ سے وہاں کے سرکاری کارندوں کو اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس نے حکومت کے ایک وزیر کو ایک کنیز اور تین سو مثقال سونا دیا۔ جس نے اُسے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی۔ جب واپس وطن پہنچا تو پھر اپنے سابقہ باطل عقائد کی تشہیر کرنے لگا۔

بتایا جاتا ہے کہ پیرِ تاریک (بایزید انصاری) کے پاس جو مُہر سیادت تھی۔ اس کی تحریر یہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " سبحانک الملک الباری، جُدا کرد عالم نوری از ناری ۔ ۔ ۔ ۔ بایزید انصاری" ایک دوسری ایسی ہی مہر پہ یہ عبارت نقش تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " بایزید مسکین ہادیٔ المضلّین"۔

بایزید نے اپنے ارادت مندوں کو قتل و غارت، لوٹ مار اور بدکاری کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ یہ لوگ بزرگوں اور آئمہ دین کے متعلق بڑی بے باکی اور گستاخی سے باتیں کرتے تھے۔ آخون درویزہ بابا بتاتے ہیں کہ" یہ لوگ بعث بعد الموت کے بھی منکر تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس جسم کو جس قدر ناز و نعمت میں رکھو اچھا ہے۔ ان کے خیال میں انسان مرنے کے

بعد دوسری صورت میں جنم لے لیتا ہے، نہ حساب ہے نہ کتاب، نہ دوزخ نہ جنت، یہی دنیا، دنیا بھی ہے اور آخرت بھی...... زندگی کے جتنے مزے لوٹ سکتے ہو لوٹو"۔

اس سلسلے میں اخون صاحب ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ اس پیر (بایزید) نے ایک عورت کو جس کا نام فاشی تھا، اپنا خلیفہ بنا کر تبلیغ پہ مامور کر رکھا تھا۔ اصل میں یہ نوجوانوں اور فاسقوں کو جال میں پھنسانے کا ذریعہ تھی۔ ایک دن وہ مجھے راستے میں مل گئی۔ میں نے اس سے سوال کیا " اللہ تعالیٰ کو تم لوگ وحدہٗ لاشریک مانتے ہو یا نہ؟..... انبیاء علیہم السلام کو سچے مانتے ہو یا نہ.....؟ قرآن مجید کی صداقت پر یقین رکھتے ہو یا نہ؟" جواب میں اُس نے کہا" میں سب کو حق مانتی ہوں....." تب میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ، انبیاء علیہم السلام اور قرآن مجید سب کی تعلیم تو یہ ہے کہ تمام مُردے قیامت کو قبروں سے اٹھیں گے۔ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبۡعَثُ مَنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ۔ حساب ہوگا، نیکوکار جنت میں جائیں گے اور بدکار دوزخ میں.... لیکن تمہارا پیر اس امر سے انکاری ہے...... اب بتاؤ تم اللہ تعالیٰ، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں کا کہا مانتی ہو یا اپنے پیر کا؟"...... وہ اس گفتگو سے حیران و ششدر رہ گئی...... میری باتوں کو مانتی تو پیر کی باتوں کا بطلان ہوتا تھا اور نہ ماننے کا کوئی جواز ہی اس کے پاس نہ تھا۔ اخون درویزہ کا کہنا ہے کہ بایزید کے اکثر ارادت مندوں کا حال یہی تھا۔ لاجواب ہوتے تو حیران کھڑے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ بایزید حدیث بیان کرتا تو اُسے بھی اپنے ہی معنی پہنا دیتا...... جو حدیث یا آیت اپنے مسلک کے خلاف پاتا اُسے ماننے ہی سے انکار کر دیتا...... عامتہ المسلمین چونکہ تناسخ اور آواگون کے چکر سے ناواقف تھے، اس لئے وہ بایزید کی باتوں کی تہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ اپنے ارادت مندوں کو بتایا کرتا تھا کہ مرنے کے بعد یہ جسم عنصری فنا ہو جائے گا اور ہر عنصر اپنے اپنے موافق عنصر سے مل جائے گا..... یہ جسم دوبارہ وجود میں نہیں آئے گا۔ لیکن رُوح (جو اس کے خیال میں جزو خداوندی ہے) دوسری صورت اور جسم میں اسی دُنیا میں رہے گی.....

جسم خواہ حیوان ناطق ہو یا حیوان مطلق مگر حیوان وجود میں داخل ہو کر اس کو زندہ کرتا اور اس میں آباد ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ دوسرے امور میں بھی بایزید انصاری کی پسند اور ناپسند کا معیار عام علماء سے جدا تھا۔۔۔۔ ۲۸ حالنامے کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ

"پیر بایزید اور ان کے مریدوں نے اس علاقے کی موسیقی کے فروغ میں بھی بڑا حصہ لیا تھا۔۔۔۔ ۲۹ حالنامے میں ان دو خزانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پیر بایزید کے ذریعے سے افغانی قوم کو ملے"۔

حالنامے میں ہے کہ

"ایک روز وہ (بایزید) دوستوں سے کہنے لگے کہ دو خزانے حق تعالیٰ نے افغانوں سے پوشیدہ رکھے تھے۔ دو شخصوں کے طفیل وہ دونوں خزانے افغانوں پر ظاہر کئے۔ ان میں سے ایک خزانہ علم توحید ہے جس کو خدا تعالیٰ نے پیر روشان کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر کیا۔ دوسرا خزانہ جو ظاہر کیا گیا ہے وہ خزانہ علم موسیقی کا ہے جو حاجی محمد خلیفہ، میر فضل اللہ دل (مرید پیر روشان) کے طفیل سے افغانوں پر ظاہر ہوا۔ اس لئے کہ پہلے افغان غنجگین (ساز) پر اکتارہ بجاتے تھے اور پانچ تار کے رباب پر یعنی سرمدہ دو تار بجاتے تھے اور اسے دوتار کہتے تھے۔

حاجی محمد کی تعلیم اور طفیل سے کئی تار سازوں میں ڈالے گئے اور نئے سے نئے نغمے نکالے۔ لیکن وہ اکثر نغمے غیر ملائم بجاتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ جب یہ سازندے پیر دستگیر (پیر روشان) کی خدمت میں پہنچے تو پیر دستگیر کی صحبت اور برکت اور طفیل سے نغمہ ملائم بجانے لگے اور چھ نغمے ایجاد کئے۔ ایک ناصری دوسرے پنج پردہ، تیسرے چار پردہ، چوتھے تین پردہ، پانچویں پردہ جنگ رجو

جنگ کے وقت بجاتے ہیں) چھٹے مقام شہادت اور اس نغمے میں بہت سے
نغمے اور بند گائے جاتے ہیں۔

" حالنامے کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی محمد سرید فضل اللہ دولی
(متوفی ۹۲، ھ ۱۲۹۳ء) نے رباب میں چند تاروں کا اضافہ کیا اور ان کی اس
ایجاد پر افغان موسیقاروں نے چند نئے نغمے اضافہ کئے تھے۔ لیکن موسیقار ان
نغموں کو غیر متوازن بجاتے تھے۔ پیر بایزید نے ان نغموں میں اصلاح کی۔ ان کی
رہنمائی میں موسیقار اس قابل ہوئے کہ سرود و سلوک اور دوسرے حسب ذیل
طربیہ نغمات کا سرود بنا سکیں۔

ناصری (دھنا سری) پنج پردہ۔ چہار پردہ، سہ پردہ، جنگی آہنگ، مقام شہادت
سرود کا ذوق پیر بایزید میں شروع ہی سے تھا۔ جب سرود ہوتا تو وجد میں آجاتے
تھے ان کے بیٹے اور پوتے بھی ماہر موسیقار تھے۔

یہ تھے دو خزانے جو پیر بایزید نے عطا کئے توحید اور موسیقی ..... " حالنامے"
میں دونوں کو اکٹھا شمار میں لانا بھی حیرت انگیز اس لئے ہے کہ توحید اور موسیقی کا باہمی ربط
کیا ہے..... پھر یہ تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ انہوں نے افغانی عوام کو موسیقی کا تحفہ دیا
لیکن کیا ان سے پہلے افغان عوام توحید اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور نہ تھے؟..... پھر
بایزید کا تحفۂ اور خزانہ توحید آخر کون سی خصوصیات لئے ہوا تھا۔

ان دو خزانوں کے علاوہ بایزید نے شعر و شاعری کا تحفہ اور خزانہ بھی قوم کو دیا۔ اس
خزانہ کا ذکر" حالنامہ میں یوں آیا ہے۔

" اس کے علاوہ اس سے پہلے پشتو شاعری میں شعر دو تین قسم سے زیادہ نہ
تھے۔ پیر دستگیر (بایزید) نے افغانی (پشتو) زبان میں قصیدے، غزلیں،
رباعیاں، قطعے اور مثنویاں کہیں اور پیر دستگیر (بایزید) کے طفیل سے

سے ان کے فرزندوں اور مریدوں نے دیوان کہے"۔

بایزید انصاری کے مذہبی عقائد سے قطع نظر سیاسی اور ادبی میدان میں انہوں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ خان روشن خان" یوسف زئی کی سرگزشت" میں لکھتے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ بایزید نے اس تحریک کے ذریعے پٹھانوں کو اپنے وطن کے تحفظ کے لئے متحد اور متفق کرنے کی سعی کی تھی۔ جس میں اُسے بڑی حد تک کامیابی ہوئی"۔ اسی قسم کے افکار کا اظہار عبدالاکبر خان اکبر نے اپنی تصنیف" رو خانیان۔ دَ مغلو تاریکیان" میں بھی کیا ہے .... بایزید انصاری کی تصانیف میں" صراط التوحید"۔" خیر البیان"۔" فخر الطالبین"۔" مقصود المومنین" اور" حالنامہ ہیں۔...... اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بایزید ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے...." خیر البیان" بڑی مقبول ہوئی..... خود اخون درویزہ نے انہی کی طرز پہ" مخزن اسلام" لکھی جو مسجع اور مقفیٰ نثر کے لئے بڑی مشہور رہے۔ بایزید انصاری کے اتباع میں پشتو شعراء کا ایک علیحدہ دبستان فکر وجود میں آیا جس کی کاوشوں سے پشتو شاعری کو چار چاند لگ گئے۔

بایزید انصاری کے بارے میں بعد کے دانش وروں اور مفکروں نے متضاد آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان کے حامی انہیں" پیر روشن" مانتے ہیں۔ جبکہ ان کے مخالف انہیں" پیر تاریک" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بنوں کے مشہور دانش ور سرفراز خان خٹک" عقاب" بایزید انصاری کے عقائد پہ تبصرہ کرتے ہوئے" تاریخ خٹک" میں لکھتے ہیں۔

> " پیر روشان (بایزید انصاری) اصلاً اسمٰعیلی (سبعی، باطنی) مذہب کا ماننے والا تھا۔ بنگشوں، آفریدیوں اور طوریوں میں اب جو لوگ اہل تشیع عقائد رکھتے ہیں وہ پہلے پیر روشان کے مُرید تھے لیکن بعد میں شیعہ مبلغین کی کوششوں سے اثنا عشری عقائد اختیار کر گئے"۔

عقاب صاحب کے نزدیک " باطنی عقیدے کا علمبردار ہونے کے علاوہ بایزید انصاری وحدت الوجود کا بھی قائل تھا۔ بلکہ اس کا نظریہ وحدت الوجود اشتمالیت کی کی حدود کو چھوتا تھا۔ وہ زر، زن اور زمین کو سبھی کی مشترکہ ملکیت سمجھتا تھا۔ اپنے مریدوں کو اس کا حکم تھا کہ جو تمہیں مال و زر نہ دے اس سے زبردستی چھین لو..... اس کا کہنا تھا کہ عورتیں پھولوں کی طرح ہیں، جنہیں ہر کوئی توڑ کر سونگھ سکتا ہے...... اس کے مریدوں میں عورتیں بھی شامل تھیں اور بلا روک ٹوک مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اس طرح کی آزادی اور ایسے نظریات کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بخوشی اس گروہ میں شامل ہوتے تھے"۔

عقاب خٹک اس امر پر اظہار اطمینان کرتے ہیں کہ

" خٹک کبھی بایزید انصاری (پیر روشن یا پیر تاریک) کے ارادت مند نہیں رہے۔ البتہ بنگش، آفریدی، اورکزئی، طوری اور چند دوسرے قبیلوں کے لوگوں نے اس کا ساتھ ضرور دیا تھا۔ تھوڑے سے یوسف زئی، محمد زئی، خلیل اور مہمند بھی اس کے ہم نوا تھے"۔

اخون درویزہ کے تذکرۃ الابرار والاشرار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر روشان کے اکثر مریدوں کو "کشفِ جنی" حاصل تھا۔ یعنی وہ جنوں کو مسخر کر کے ان سے غیب کی باتیں معلوم کرتے تھے۔

مفسر قرآن حافظ محمد ادریس (مرحوم صدر شعبۂ عربی، پشاور یونیورسٹی) بایزید انصاری کی کتاب "صراط توحید" پر مقدمہ لکھتے ہوئے اس کے عقائد پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

"بایزید اپنے خیالات کے لحاظ سے بے حد انتہا پسند تھے۔ جن دنوں ریاضت میں منہمک ہوتے بقول حضرت اخون درویزہ راہ چلتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے کہ کوئی چیونٹی

ان کے پاؤں تلے آکر ماری نہ جائے۔ لیکن جب اصلاح وارشاد کی طرف متوجہ ہوتے تو اسی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سب لوگوں کو مشرک قرار دیتے اور علماء و مشائخ کے اقوال و اعمال پر زبردست تنقید کرتے۔ اسی لئے ان کی مقبولیت دن بدن کم ہوتی گئی۔ بعد میں انہوں نے نامور بزرگ سید علی ترمذی (پیر بابا) کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا تو ان کی قوت و شہرت کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچا۔ بالآخر سیاسی بغاوتوں کے نتیجے میں مغلیہ حکومت کی مادی طاقت اور اخون درویزہ کے علمی استدلال نے ان (بایزید انصاری) کی مذہبی اور سیاسی دونوں تحریکوں کو کچل کر رکھ دیا"۔

سید عبدالجبار شاہ اپنی خود نوشت میں بایزید انصاری کی اسی انتہا پسندی کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ" جب تیراہ کے قبائل بایزید کے بھڑکانے پر مغلوں کی فوج اور تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے لگے تو مغل بھی لشکر کشی پر مجبور ہو گئے۔ ان کے کارندوں نے اہل تیراہ کو سمجھایا کہ وہ مغلوں کو لڑائی پر مجبور نہ کریں ورنہ شاہی فوجیں حملہ کر کے انہیں آزادی سے محروم کر دیں گی۔ اس پر بہت سے تیراہی بایزید کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بایزید نے جب اپنی بازی ہارتی ہوئی دیکھی تو اس نے تیراہ کے سادہ لوح لوگوں کو پیغام بھیجا کہ

> " میں خداوند تعالیٰ سے وعدہ لے چکا ہوں کہ تم پر کوئی بادشاہ یا قبیلہ غالب نہ آسکے گا۔ تم ہمیشہ آزاد رہو گے۔ البتہ تم نے محض بادشاہوں کی رضا جوئی کے لئے پیر سے بے وفائی اور وعدہ خلافی کی تو عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اس لئے تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ توبہ گار رہو کر اور اپنے ہاتھ باندھ کر میری قدم بوسی کے لئے آؤ اور تجدید توبہ کرو"۔

اس پیغام سے ڈر کر اہل تیراہ میں سے تین بتیس (۳۲) شخص ہاتھ باندھ کر توبہ کی نیت سے جب پیر (بایزید) کے پاس حاضر ہوئے تو پیر نے سب کو گرفتار کر کے ان کے

۲۲۰

سر قلم کر دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جب ان تین سو بیس آدمیوں کو قتل کرا چکا تو ایک سفید گھوڑے پر سوار رہوا۔ اس کے مرید بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان سب نے لاشوں پر یوں گھوڑے دوڑائے کہ مقتولوں کی ہڈیاں تک سرمہ بن گئیں۔۔۔۔۔ یہ تھا انتہا پسندی کا عالم کہ چونٹیوں کے مارنے سے بچنے والا طاقت پاکر ایسی سفاکانہ حرکت پر اتر آیا۔

اخون درویزہ لکھتے ہیں کہ اپنے تناسخی عقیدہ کی وجہ سے شروع میں بایزید ساگ تک نہ کھاتا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں ساگ اور گھاس میں بھی جان نہ ہو۔

مشہور صحافی اللہ بخش یوسفی ۱۹ ر نومبر ۱۹۶۶ء کے ہفت روزہ "آواز پختون" میں اس امر کا ادعا کرتے ہیں کہ بایزید انصاری کے زیر اثر تمام پختون ایک آواز پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ پختونوں نے بحیثیت قوم اتحاد اور اتفاق کر لیا تھا انہوں نے اپنے تمام خاندانی، علاقائی اور نسلی حتیٰ کہ مذہبی عقائد کو بھی ایک طرف رکھتے ہوئے اتحاد کا دامن تھام لیا تھا۔۔۔۔۔۔ (بقول ان کے) بایزید نے انہیں یہی سبق دیا تھا کہ پختون آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا چاہیئے۔ وہ کسی بیرونی طاقت کا طوقِ غلامی اپنی گردن میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح یہ تحریک مذہبی اور سیاسی عقائد کا ایک ملغوبہ تھی۔ مغل حکمرانوں نے اس کے خلاف پہلے تو الحاد اور زندقہ کے فتوے لگوائے۔ پھر خانہ جنگی پیدا کر دی"۔

جہاں کئی سیاسی حلقے بایزید کی تعلیمات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کی تحریک کو ایک وطنی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہیں بہت سے ایسے دانشور بھی ہیں جن کے نزدیک یہ محض ایک وقتی شورش تھی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس ضمن میں مردان کے مشہور عالم دین مولانا دلدار اللہ صاحب روزنامہ "جہاد" مورخہ ۱۳ر جولائی ۷۶ء

میں رقمطراز ہیں کہ

" اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بایزید اس کے جانشین پختونوں کی خود مختار حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے مغل ان کے خلاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بایزید اور اس کے پیرو کار خود یوسف زئی اور دوسرے پختون قبائل سے برسرِ پیکار رہے...... اصلی بات یہ ہے کہ روشنائیوں نے کابل جانے والے ایک تجارتی قافلے کو لوٹ لیا تھا جس سے حکومت وقت اور ان کے درمیان مخاصمت چل نکلی اور کابل کے مغل گورنر میرزا حکیم کو حاکم پشاور معصوم خان کو ان کی سرکوبی کے لئے ہدایت دینی ہی پڑی"۔

رسالہ "صراط التوحید" کے دیباچہ میں عبدالشکور صاحب (سابق مہتمم عجائب گھر پشاور) نے بایزید کے بارے میں لکھا ہے۔

" بیسویں صدی کے اکثر محققین اور روشن خیال مفکرین کا خیال ہے کہ بایزید انصاری (جو پیر تاریک اور پیر روشن کے ناموں سے مشہور رہیں) درحقیقت ایک مبلغ رہنما، سیاست دان اور ادیب تھے۔ حضرت اخون درویزہ بابا نے مذہبی تعصب، ذاتی عناد اور سیاسی اختلافات کی بناء پر انہیں ملحد اور زندیق ٹھہرایا"۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے انسانی محاکموں میں اختلافات کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے، ہر واقعہ کی توجیہہ کئی طرح ہو سکتی ہے۔ تاہم جہاں تک پیر بابا علیہ الرحمۃ کا تعلق ہے انہوں نے بایزید سے مناظرے ضرور کئے۔ وہ اس سے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف بھی رکھتے تھے تاہم انہوں نے اس سخت گیری اور شدتِ جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا جو اخون درویزہ یا دوسرں کیطرف سے دیکھنے میں آیا.... آج چار سو برس گزر جانے کے بعد پیر بابا اور اخون درویزہ سے اہل سرحد کی عقیدت کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔ تاہم بایزید انصاری اور اسکے اخلاف کے کوئی ارادت مند کہیں دیکھنے میں نہیں آتے۔



پیر باباعلیہ الرحمتہ کے بارے میں کوئی تحریر اخون درویزہ باباؒ کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہلاسکتی۔ پیر باباؒ کی زندگی میں[1] اُن کی وفات کے بعد اخون درویزہ نے ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ تصنیف وتالیف کا میدان ہو یا مخالفین سے مناظرے کا اجتماع اخون درویزہؒ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ بڑی قدآور اور زوردار شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں ان کے حامی اور ارادت مند ان کی انتہائی عزت کرتے اور انہیں اپنے دور کی سب سے بڑی علمی شخصیت مانتے ہیں۔ وہیں ان کے مخالف اور حریف اُن پر تنقید کے نشتر چلانے سے ذرا نہیں چوکتے۔۔۔۔۔۔ وہ دوستوں کے حلقے میں جتنے محترم اور معزز ہیں دشمنوں کے نزدیک اتنے ہی مورد عتاب شاید یہی وجہ تھی کہ" انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" کے مرتب کرنے والوں نے ان کے بارے میں مشورہ دیا تو یہی دیا:

"اخون درویزہ" کے بیانات کو بہت ہی احتیاط سے پڑھنا چاہیئے کہ وہ بایزید کی تعلیمات کا عقیدتاً مخالف ہے"

شاید یہ رائے دیتے وقت یہ مقالہ نگار پٹھانوں اور بالخصوص ان کے دینی علماء کی تعنیات کو پیش نظر نہیں رکھ سکا۔ وہ یہ بھول گیا ہے کہ پہاڑوں میں بسنے والے یہ لوگ انتہا پسندانہ مزاج رکھتے ہیں۔ جہاں وہ دوست پر جان تک چھڑکنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

وہیں دشمن اور مخالف کو ہرگز ہرگز نہیں بخشتے، پھر یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض لوگ عشق اور جنگ میں ہر حربے کو جائز سمجھتے ہیں۔...... اگر اخون درویزہ نے بایزید انصاری اور اس کے ہم مشربوں سے سخت گیری برتی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جب دونوں فریق ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے تو مذہبی طور پر بھی اور سیاسی طور پر انہوں نے ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ دونوں فریقوں کی کشمکش اور آویزش کو اسی پس منظر میں دیکھنا بہتر ہوگا۔ آج کے قاری کو چاہیئے کہ "سخن فہم" بننے کی حد تک اکتفا کرے اور "طرفداری" اور "جانبداری" سے پہلو بچاتے رکھے۔

ہم یہ بات پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ انبیائے کرام کے علاوہ ہم کسی کو معصوم نہیں مانتے.... ہو سکتا ہے ایک ہی بیان یا ایک ہی تحریر کو پڑھ کر دو شخص اس کے بارے میں مختلف رائے اور محاکمہ قائم کریں۔ انسانوں میں اختلاف رائے کا ہونا قدرتی امر ہے۔ ایک ہی مسئلے کے متعلق مختلف علماء مختلف توجیہات پیش کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ پیر بابا اور بایزید یا ان کے ارادت مندوں کے مابین جنگ کسی دنیوی غرض کے لئے نہیں تھی (اگرچہ بعد میں اختلافات نے کچھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر لیا تھا) محض مذہبی عقائد کا اختلاف تنازعے کی بنیادی وجہ تھا۔ اس لئے ان بزرگوں کی کسی غلطی یا زیادتی کو عام انسانی غلطی کی بجائے "اجتہادی غلطی" سمجھنا ہی بہتر ہوگا۔ ان میں سے دونوں حضرات کی کسی تحریر و تقریر کو حرفِ آخر نہیں سمجھا جا سکتا اگر ان کی تحریر قرآن و سنت کے مطابق ہے تو اسے اپنانے میں حرج نہیں اور اگر ان کی کوئی رائے قرآن حکیم اور سنت نبوی کی روح کے خلاف ہے تو اس سے چشم پوشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔

"دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق اخون درویزہ ایک آتش بیان خطیب، اثر انگیز مقرر، مؤلف اور نہایت سخت گیر متعصب تھے، پشتو، فارسی اور عربی میں تقریر کرتے تھے شعر کہتے تھے اور حاضرین پر چھا جانے کا وصف رکھتے تھے"۔

اخون درویزہ کے مخالف بھی یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں مذہبی آزاد خیالی اور ملحدانہ نظریات نے عام مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ...... لوگ ارکانِ اسلام پر عمل پیرا ہونے کی بجائے فروعی اختلافات اور موشگافیوں میں وقت ضائع کر رہے تھے۔ تناسخ، آواگون، جادو ٹونے وغیرہ کے ہندوانہ نظریات مسلمانوں میں بھی رواج پا رہے تھے ...... دینی تعلیم کے مدرسوں کا انتظام تھا نہ تبلیغ اسلام کی کوئی منظم کوشش، ایسے میں اگر پیر باباؒ، اخون درویزہؒ، اخون پنجوؒ اور ان کے دوسرے ہم عصر فروغ و اشاعتِ اسلام کے لئے میدان میں نہ نکلتے تو صورت حال بڑی ناگفتہ بہ ہوتی ...... ان حضرات بالخصوص اخون درویزہؒ کی سرگرمیوں کو بھی اسی سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھنا چاہئیے۔ یہ ضرور ہے کہ اخون درویزہ نے اپنے مذہبی مخالفوں کے خلاف قلم اور زبان سے تلوار کا کام لیا لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی مساعی حسنہ سے سرحدی مسلمان پھر سے اسلام کے بنیادی ارکان پر کاربند ہو گئے اور ان باہمی مناظروں اور مجادلوں کی بدولت ان سارے علاقوں میں ایک اسلامی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد ملی جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔

اخون درویزہؒ کا شمار پاکستان کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مغلیہ دورِ حکومت میں اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کئے رکھا۔ وہ سید علی غواص پیر باباؒ علیہ الرحمتہ کے خلیفۂ خاص اور دستِ راست تھے ...... وہ اصلاً ننگرہار کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے لقب سے ہی پہچانتے ہیں اور ان کا اصل نام اسی لقب سے دب کر رہ گیا ہے۔ کئی ذرائع نے ان کا نام عبدالکریم بتایا ہے۔ لیکن یہ ان کے ایک بیٹے کا بھی نام ہے (غالباً عبدالرشید نام تھا) درویزہ گدائی کے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یوں ہے، درویزہ بن گدائی بن سعیدی جیون بن جنبتیؒ ...... اخون درویزہ کے مطابق جیون بن جنبتی کابل کے مشرق میں درۂ مہمند میں اقامت گزین تھے، وہ اصل میں قندوز کے رہنے والے ترک تھے اور بلخ کے

ترک حکمرانوں کے قرابت دار تھے۔ جب مہمندوں سے کوئی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا تو بلخ کے حکمرانوں نے ان کی مدد کی اور وہ ننگرہار کے سردار قرار پائے۔ لبعد کے جھگڑوں میں سعدی مارے گئے تو ان کے بیٹے گدائی نے بونیر کے علاقہ اسمٰعیل خیل میں جعفر زئی کے مقام پر سکونت اختیار کرلی۔

گدائی نے پاپین کے شہزادوں کے خاندان کی ایک خاتون قراری بنت ملک ناز د خان سے شادی کی، ۹۴۰ھ ہجری میں اللہ نے اس خاتون کو اخون درویزہ سا بیٹا دیا جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا۔ درویزہ بچپن ہی سے زہد و عبادت کی طرف مائل تھے اور عام بچوں کے برعکس کھیل کود اور گھر بار کے کاموں میں دلچسپی نہ لیتے تھے، ایام جوانی میں انہوں نے ملاّ سنجر پاپینی ملا مصر احمد ملاّ زنگی پاپینی اور ملاّ جمال الدین ہندی سے دینی کتابیں پڑھیں ...... لبعد میں طریقت کے رموز و اسرار تک پہنچنے اور حصول معرفت کی خاطر وہ اپنے استاد ملاّ سنجر کی ہدایت پر شیخ الاسلام، سید المسلمین غوث خراسان سید علی ترمذی المعروف پیر بابا ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ..... اخون درویزہ نے اپنے علمی مشاغل، شوق زہد و ریاضت کے ساتھ ساتھ اپنی روحانی بے قراری کا ذکر بھی حضرت پیر بابا ؒ سے کیا۔ پیر بابا ؒ اپنی باطنی بصیرت کی بدولت فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا:۔

”شیخ کامل افغان گشتہ“

ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ شیخ کامل کی اجازت کے بغیر زہد و ریاضت کا انجام کبھی کبھی نقصان رساں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا مبتدی کو چاہیئے کہ زہد و ریاضت اس طریق پر کرے جو طریقہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ثابت ہے، کافی دیر تک نصیحت کرنے کے لبعد انہوں نے اخون درویزہ ؒ سے تجدید توبہ کرائی اور نماز باجماعت، ایام بیض کے روزوں اور صلوٰۃ اوابین اور دوسرے واجبات و سنن پر مستقیم رہنے کی تاکید کی۔

اخون صاحب ؒ پانچ سال تک اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہے اور ان کی ہدایات پر

عمل کرتے رہے۔ پھر اپنے استاد علامہ مولوی حاجی محمد المشہور زنگی پاپینی کی وساطت سے حضرت پیر بابا علیہ الرحمتہ کی خدمت میں درخواست کی "علم ظاہر سے آراستہ ہوں، عبادت پر استقامت حاصل کر چکا ہوں۔ اب ذکرِ الٰہی کی تلقین کی جائے"۔

جناب پیر بابا" نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے طریقہ عالیہ چشتیہ میں داخل کر کے ذکر الٰہی کی تلقین کی اور فرمایا "اس وقت کا انتظار کرو۔ جب تمہارا قلب ذکر الٰہی سے معمور ہو جائے گا اور تم کلی طور پر مطمئن ہو جاؤ گے ....."۔ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اخون صاحب کو اطمینان کامل نصیب ہوا اور وہ اپنے مرشدِ کامل کی توجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں مقامات جلیلہ اور عظیمہ تک پہنچ گئے۔

علوم متداولہ کی کتابیں تو اخون درویزہ" پڑھ ہی چکے تھے۔ اب پیر بابا" کی ہدایت پر تصوف کی کئی کتابیں مثلاً جام جہاں نما، لمعات، لوائح اور دیوان انوار خواجہ قاسم وغیرہ بھی ان سے سبقاً سبقاً پڑھیں..... اپنے مرشد گرامی سے روحانی تربیت مکمل کرنے کے بعد اخون درویزہ بابا" کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اجازت دے دی گئی۔

اخون درویزہ بابا" نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ کما حقہٗ ادا کیا۔ انہوں نے قاشقار (چترال)، کشمیر اور دوسرے دور دراز مقامات کے دورے کئے اور وہاں کے علماء، صلحاء اور فقراء سے استفادہ کیا۔ جب واپس اپنے شیخ گرامی" کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے چاروں سلسلوں میں انہیں ماذون اور معنعن فرمایا...... ماذون اور صاحب اجازت ہونے کے بعد انہوں نے عامتہ المسلمین کی اصلاح کی کوششیں تیز تر کر دیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ دور دینی اعتبار سے بڑی ابتری کا دور تھا...... جو اٹھتا اپنے بھونڈے عقیدوں کا ڈھنڈورہ پیٹتا...... اکثر لوگ شرک و بدعت اور غیر اسلامی عقائد اختیار کر چکے تھے...... ہر طرف بے عمل علماء، نام نہاد صوفیاء اور اباحتی پیروں کی بھرمار تھی وہ لوگ محض دنیوی فوائد کے لئے لوگوں کو اپنی شعبدہ بازیوں سے گمراہ کرنے میں مصروف

تھے۔ ایسے میں حضرت اخون درویزہؒ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کران ملحدوں اور منکران دین کے خلاف آخری دم تک اپنے قلم اور زبان سے جہاد کیا۔۔۔۔ بتیبیں[۳۲] سے زاید گمراہوں کی نام نہاد پیشوائیت کا خاتمہ کیا (تفصیل پہلے آچکی ہے) ان سے مناظرے کر کے انہیں لاجواب کیا اور اس طرح عوام ان کے جال سے آزاد ہو گئے۔

یوں تو ان گمراہوں کے سحرِ باطل کو توڑنے کے لئے پیر باباؒ کو بڑی محنت کرنی پڑی تاہم اس سلسلے میں ان کے سب سے بڑے معرکے بایزید انصاری کے ساتھ ہوئے۔ بایزید انصاری کو انہوں نے "پیر تاریک" کا نام دیا اور اس کے پیروکاروں کو "تاریکی" کہا جانے لگا۔

اخون درویزہ باباؒ کو اعتراض تھا کہ بایزید انصاری :-

۱۔ کل اشیائے موجودہ کو خدا کہتا تھا اور مخلوقات صوری کو ذاتِ خدا جانتا تھا۔

۲۔ بعث بعد الموت کا منکر تھا۔

۳۔ نامحرم عورتوں میں بیٹھتا تھا۔ اس کی مجلس میں عورتیں اور مرد اکٹھے شریک ہوتے تھے۔

۴۔ عقیدۂ تناسخ کا قائل تھا اور کہا کرتا تھا کہ حیوانات کے مرنے کے بعد وجودِ صوری نیست و نابود ہو جائے گا۔ لیکن روحیں دوسرے حیوانوں کی صورت میں آئیں گی۔

اپنی تصنیف "صراط توحید" میں بایزید نہ صرف اپنے والد کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ بلکہ خود کو خالص توحید پرست اور دوسروں کو مشرک بھی قرار دیتا ہے۔ وہ مرشدِ کامل سے ملنے کے لئے بے تابی کا اظہار بہت کرتا ہے۔ لیکن آخر تک مرشدِ کامل کو پا نہیں سکتا۔

"تذکرہ علماء و مشائخ سرحد" کے مطابق اخون درویزہؒ نے تین بار اس شخص سے مناظرہ کیا۔ ہر بار اس نے شکست کھائی۔ آخر چوتھی بار فیصلہ کن مباحثہ کے لئے اُسے بلایا

گیا تو وہ سامنے نہ آیا۔

حضرت اخون درویزہ" بابا نے فروغ و اشاعت اسلام کی راہ میں صرف قلم اور زبان ہی سے جہاد نہیں کیا بلکہ اپنی جان اور اولاد تک کو داؤ پر لگا دیا۔ انہوں نے کوہستان کے کافروں کو داخل اسلام کرنے کے لئے مہمیں بھیجیں۔۔۔۔۔ اسی طرح کی ایک مہم میں خود اخون درویزہ" کے صاحبزادے عبدالکریم نے شہادت پائی۔۔۔۔۔۔ ان کا مزار آج بھی میں مرجع خاص و عام ہے۔ عبدالکریم صاحب کو لوگ "شہید بابا" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح اخون درویزہ" نے سارے علاقہ یوسف زئی کا دورہ کرکے ایک لشکر جرار جمع کیا اور بایزید انصاری اور اس کے ساتھیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ آخری قابل ذکر معرکہ میں بایزید کے پیروکاروں کا کیمپ موضع باجا، مینی اور کوٹھہ کے پاس نصب تھا جبکہ اخون درویزہ اور ان کے ارادت مند موضع جھنڈا، لوکا اور ڈیلور میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ دونوں فریقوں کے لڑاکوں میں اجمیر نامی پہاڑی پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یوسف زئی رضاکاروں کی کمان اخون درویزہ کے ہاتھوں میں تھی۔ یوسف زئی کے قبیلہ اکوزئی نے اس موقع پر بڑی شجاعت دکھائی۔ اسی قبیلے کے سردار ملک حمزہ خان کے ہاتھوں بایزید انصاری کے ساتھیوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔۔۔۔۔ بایزید کے بیٹے یا تو قتل ہوئے یا فرار ہو گئے اس کے بعد انہیں پھر سے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور یوں بایزید کی تحریک دم توڑ کر رہ گئی۔

اخون درویزہ اور بایزید انصاری کے مابین ہونے والے معرکوں کے بارے میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اخون درویزہ کی کوششوں کی حمایت کرتے ہیں کہ اس نے بایزید کے پھیلائے ہوئے غلط عقیدوں کے خلاف جہاد کیا اور لوگوں کو پھر سے سیدھے راستے پر گامزن کر دیا۔ جبکہ دوسرا گروہ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ مغلوں کے ایماء پر مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر ان علاقوں کے لوگوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کیا گیا۔ چنانچہ ان

لڑائیوں میں طرفین کے ہزاروں لوگ مارے گئے۔

میفات

اخون درویزہؒ کے بارے میں جو رائے بھی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے پشتو زبان و ادب کے فروغ کے لئے بڑا کام کیا۔

انہوں نے "مخزنِ اسلام" لکھی جس میں پشتون عوام کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ "مخزن" پشتو نثر کی کتاب ہے۔ جس میں مسجع، مقفیٰ عبارت بڑی رنگینی اور عمدگی سے پیش کی گئی ہے۔ اس طرزِ نگارش کو اتنا پسند کیا گیا کہ خود بایزید انصاری کے پیروکاروں نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اس سے قبل پشتو کو ادبی زبان نہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد پشتو نثر کی بڑی ترقی ہوئی۔ اخون درویزہؒ اور بایزید کے مذہبی مناظروں کی وجہ سے یہاں پایا جانے والا صدیوں کا سکوت ٹوٹا۔ لوگوں میں مذہبی جوش اور جذبہ پیدا ہوا اور وہ اسلامی تعلیمات کی طرف مائل ہوتے گئے۔

اخون درویزہؒ کی تصنیفات "مخزنِ اسلام" کو بہت شہرت ملی۔ یہ پشتو کی مسجع نثر میں لکھی گئی ہے، کہیں کہیں عربی اور فارسی عبارات بھی آگئی ہیں۔ کتاب میں اہل سنت والجماعت کی تشریح عمدگی سے کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس میں مسلمانوں کے مذہبی فرقوں اور بایزید انصاری کے حالات بھی درج ہیں۔

اخون صاحبؒ کی دوسری تصنیف "تذکرۃ الابرار والاشرار" ہے جو فارسی میں ہے۔ اس میں جہاں سیّد علی ترمذی (پیر باباؒ) کے مریدوں اور عقیدت مندوں (ابرار) کے احوال درج ہیں وہیں بایزید انصاری (پیر روشن) اور ان کے خاندان اور ساتھیوں (اشرا) کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ فقہ، تفسیر، عقائد اور تصوف کی ابتدائی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

"ارشاد الطالبین" فارسی میں چار ابواب پر مشتمل کتاب ہے۔ جس میں توحید، ایمان نماز، وضو، توبہ، پیر کامل کی تلاش، علم اور ذکر، علامات قیامت وغیرہ پر بحث کی

گئی ہے۔

"شرح قصیدہ امالی" ...... فارسی زبان میں مخطوطہ کی صورت میں ہے اور ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

آخری عمر میں اخون درویزہؒ نے پشاور شہر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کی وفات ۱۰۴۸ھ ہجری میں یہیں ہوئی ..... ان کا مزار پشاور سے کوئی میل ڈیڑھ میل دور ہزار خانی روڈ پر واقع ہے، اس وقت تک کسی عورت کو آپ کے مزار کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ عورتیں باہر کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھتی ہیں۔ پشاور میں یہ بات عام طور پر مشہور رہی ہے کہ اگر کوئی بچہ غبی اور کند ذہن ہو یا جسے قرآن مجید حفظ نہ ہوتا ہو وہ آپ کے مزار پر جاکر تین یا پانچ یا سات جمعرات قرآن خوانی کرے تو اس کی زبان رواں ہوجاتی ہے۔

اخون صاحب کے مرید اور بایزید انصاری کے خلاف جنگ کرنے والے سردار ملک حمزہ خان اکوزئی کی آخری آرام گاہ بھی اسی احاطے میں ہے۔

اخون درویزہ کے صاحبزادے، پوتے اور پڑپوتے بھی اپنے اپنے وقت کے نامور عالم دین ہوئے ہیں۔

- - - - - - - - -

[illegible]

۸

خلفاء اور اولاد

حضرت سید علی غواص ترمذیؒ المعروف پیر باباؒ کے مریدانِ شریعت کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے جبکہ مریدانِ طریقت اور ماذون خلفاء کی تعداد بھی اس نسبت سے ہوگی۔ تاہم ان سب کے حالات دستیاب نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے ماذون خلفاء بیس کے قریب تھے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ خلیفہ اعظم اخون درویزہ ننگرہاری

حضرت پیر باباؒ کے خلفائیں سے سب سے زیادہ شہرت حضرت اخون درویزہ باباؒ کے حصے آئی۔ انہوں نے اپنے مرشدِ گرامی کی زندگی میں بھی ۲۹ سال تک شب و روز ان کا ساتھ دیا۔ ان کی طرف سے مخالفین اور بد عقیدہ لوگوں سے مناظرے اور مجادلے کئے۔ کفار کے خلاف جہاد میں سرگرم حصہ لیا۔ مرشد کے وصال کے بعد جس نے اپنے مرشد کے مشن کو آگے بڑھانے کی سب سے زیادہ کوشش کی وہ بھی اخون درویزہ ہی تھے۔ یہ خدمت بھی اخون درویزہؒ ہی نے انجام دی کہ اپنے مرشد گرامی کے حالات قلمبند کر کے ہم تک پہنچائے۔ انہوں نے پشتو زبان و ادب کو ذریعہ اظہار بنا کر اس زبان کو فروغ اور تقویت بخشی۔

حضرت اخون درویزہ متبحر عالم تھے متقی انسان تھے۔ دین کے اس درجہ عاشق تھے۔

نے اپنے فرزند عزیز کو کوہستان میں کفار کے خلاف جہاد میں بھیجا جہاں وہ راہ حق میں شہید ہوگئے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے ان کی طبیعت مائل بہ شدت تھی اور وہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت پر بھی سخت گرفت کرنے والے تھے۔

حضرت اخون درویزہؒ نے طویل عمر پائی۔ زیادہ عرصہ یوسف زئی میں زندگی گزاری تاہم آخری دنوں میں پشاور آگئے۔ انہوں نے یہیں وفات پائی۔ ان کا مزار پشاور شہر کے مشرق میں ہزار خوانی کے نواح میں مرجع خلائق ہے۔ خواتین کو مزار کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، ان کی یہ کرامت آج بھی مشہور ہے کہ غبی اور کند ذہن بچے، جنہیں قرآن حفظ کرنے یا ناظرہ پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی ہو، اگر ان کے مزار اقدس پہ تین بار، پانچ بار یا سات بار جمعرات کو حاضر ہو کر قرآن خوانی کریں تو اللہ کی مہربانی سے ان کا حافظہ کھل جاتا ہے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد گجراتی

حضرت مولانا محمد گجراتی کا شمار بھی حضرت پیر باباؒ کے ماذون حضرات میں ہوتا ہے۔ عالم فاضل انسان تھے۔ فقہ پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ اپنے اوصافِ حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کی وجہ سے حضرت کے خلفاء میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

۳۔ حضرت مولانا عبدالکریم شہید باباؒ

اخون درویزہ علیہ الرحمتہ کے فرزند رشید مولانا عبدالکریم اپنے نامور والد کی طرح عالم فاضل انسان تھے اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے ہر وقت مستعد اور کمربستہ رہتے تھے۔ انہوں نے پیر باباؒ کی خدمت میں رہ کر فیض پایا اور طریقت کی تکمیل کی۔ جب کفار کوہستان کے خلاف جہاد کی نوبت آئی تو بھی اخون عبدالکریم پیش پیش رہے اور راہِ خدا میں شہادت پائی۔ ان کا مزار شریف کانجو (سوات) کے علاقہ ننگ پی خیل میں مرجع خاص و عام ہے۔ وہ شہید باباؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔

۴۔ حضرت مولانا ابابکر دانشمند تیہاڑیؒ

حضرت مولانا ابابکر دانشمند تیہاڑیؒ عابد و زاہد، متقی اور عالم باعمل شخص تھے۔ اکثر گوشہ نشین رہتے تھے۔ علم تصوف کے اسرار و رموز میں یکتائے روزگار تھے، ان کی ساری زندگی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں گزری۔ بڑی قابل قدر ہستی تھے۔

۵۔ حضرت مولانا صالح الکوزئیؒ

حضرت مولانا صالح الکوزئی علیہ الرحمۃ بھی عالم کامل اور فاضل بے بدل انسان تھے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کافی عرصہ قندہار کے قاضی حکومت رہے، مرشد کامل کی تلاش میں نکلے تو کافی مشکلات سے دو چار ہونے کے بعد بالآخر حضرت پیر باباؒ کی خدمت میں پہنچے اور پھر یہیں کے ہو رہے، پیر باباؒ سے بیعت اور اجازت طریقت کے بعد دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ عمر کے آخری حصے میں ان پر مجذوبانہ رنگ غالب رہا۔ ان کا مزار شریف موضع شلبانڈی (علاقہ بونیر، سوات) میں زیارت گاہ خواص و عوام ہے عام طور پر وہ دیوانہ باباؒ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

۶۔ حضرت ملا یوسف بن الیاسؒ

حضرت پیر باباؒ کے ایک اور خلیفہ مجاز حضرت ملا یوسف بن الیاس گدائی زئی ہیں جو عوام میں اخون یوسفؒ کے نام سے مشہور ہیں، اخون کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ وہ عالم فاضل انسان تھے اور شریعت محمدیہ کی پیروی میں پوری طرح کوشاں رہتے تھے۔ ان کا مزار موضع ملندری میں سڑک کے کنارے موجود ہے۔

۷۔ حضرت مولانا کابل گرامؒ

حضرت مولانا کابل گرام بھی حضرت پیر بابا سے ماذون تھے۔ تفصیل حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ ان کا مزار دریائے سندھ کے کنارے پر ہے۔

۸۔ حضرت مولانا تور باباؒ

مولانا تور باباؒ بھی رمز شناس طریقت اور عالم فاضل

شخص تھے۔ مزار موضع ایلئی علاقہ بونیر ضلع سوات میں ہے۔

۹۔ حضرت اخون گدائی ؒ

حضرت اخون گدائی بھی مردِ میدان طریقت تھے اور حضرت پیر باباؒ کے ماذون، مزار شریف میرہ سالارزئی علاقہ بونیر سوات میں ہے۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے جہاں پیر باباؒ سید علی غواص ترمذیؒ کو دیگر بہت سی نعمتوں اور کامیابیوں سے نوازا وہیں انہیں اولادِ صالح سے بھی نوازا۔ صدیاں بیت جانے اور کئی نسلیں گزر جانے پر بھی ان کی اولاد دینی محبت اور دُنیوی وجاہت دونوں میں ممتاز حیثیت کی مالک چلی آرہی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس سادات گھرانے میں ایسے عظیم انسان جنم لیتے رہے جنہوں نے نہ صرف اپنے علاقے کی تاریخ میں نمایاں جگہ پائی سارے عالم اسلام میں بڑا نام پایا۔

پیر بابا سید علی ترمذیؒ کے دو فرزندان گرامی تھے۔ ایک کا نام سید حبیب (یا سید عبداللہ) تھا جو نوجوانی ہی میں لاولد فوت ہو گئے اور جن کا مزار اعلیٰحضرت پیر باباؒ کے مرقد پُرانوار کے ساتھ متصل واقع ہے۔ دوسرے صاحبزادے سید مصطفیٰ تھے جو ۹۷۲ ھجری بمطابق ۱۵۶۴ عیسوی کو پیدا ہوئے اور ۱۰۲۴ ھجری (مطابق ۱۶۱۵ عیسوی) کو وفات پا گئے۔ انہیں حکومت وقت کی جانب سے علاقہ کونڑ بطور سیری (جاگیر) ملا ہوا تھا لہذا وہ وہیں پر سکونت پذیر رہے اور ان کا مزار بھی وہیں پر موضع پشت میں مرجع خاص و عام ہے۔ کونڑ کی آبادی جلال آباد سے شروع ہو کر کافرستان (چترال) تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ وادی بہت زرخیز ہے۔ اس میں دریائے کونڑ شمال کی طرف سے بہتے ہوئے آتا ہے اور ضلع ننگرہار میں دریائے کابل سے مل جاتا ہے۔

حضرت سید مصطفیٰؒ نے ان علاقوں میں اپنے والد گرامی حضرت پیر باباؒ کے مشن کو جاری رکھا اور انہی کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے شریعت کی تبلیغ میں ہر ممکن کوشش کی۔ افغانستان کے لوگوں کو ان سے مستفیض ہونے کا زیادہ موقع ملا اور یہ انہی حضرات کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اہلِ افغانستان تقریباً سب کے سب حنفی مسلک کے پیرو کار ہیں بلکہ جہادِ اسلامی کے پرچم کو بھی بلند رکھے ہوئے ہیں۔ سالہا سال سے وہ ایک بہت بڑی عالمی طاقت کے خلاف جان و مال کی قربانی دے رہے ہیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش آنے نہیں پائی۔

حضرت پیر باباؒ اور ان کے اخلاف کی انہی اسلامی خدمات کی وجہ سے ان سارے علاقوں میں ان کی اولاد بڑے عزت و احترام کی مالک ہے۔ یہاں تک کہ امیر حبیب اللہ خان کے زمانے تک کابل کے سلاطین و حکمران اسی جذبۂ عقیدت کے پیشِ نظر اپنی بیٹیاں تبرکاً اور تیمناً سادات کونڑ کے اس گھرانے میں بیاہ دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے رہے۔ چنانچہ امیر کبیر دوست محمد خان (بانیٔ خاندان محمد زئی) کی بہنیں اور بیٹیاں ان سادات کے گھروں میں تھیں۔

حضرت سید مصطفیٰ اپنے والدِ بزرگوار حضرت پیر باباؒ کے صحیح مسند نشین اور صاحب کشف و کرامات ہستی تھے، اللہ نے انہیں تین بیٹے عطا کئے۔ (۱) سید عبدالوہاب (عرف میاں عبدل بابا) سید قاسم اور سید حسن، کونڑ کا علاقہ بڑے صاحبزادے سید عبدالوہاب کو ورثہ میں ملا جبکہ بونیر وغیرہ کی املاک دوسرے دو فرزندوں کے حصے میں آئی۔ یہ سبھی حضرات جہاں خاندانی وجاہت، شجاعت، سخاوت و دیانت کی خوبیوں سے مالا مال تھے وہیں علم و فضل اور باطنی کمالات میں بھی اوجِ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔

سید عبدالوہابؒ اور سید قاسمؒ کے گیارہ گیارہ بیٹے تھے۔ جبکہ سید حسنؒ کے دو ہی فرزند تھے۔ پہلے دونوں حضرات کی اولاد بہت کثرت سے ہے۔ سید حسن صاحبؒ کی اولاد اگرچہ کم ہے

لیکن بڑی معزز اور متموّل ہے۔

سیّد عبدالوہابؒ المعروف میاں عبدل باباؒ

آپ مادرزاد ولی تھے۔ ولادت ۹۹۹ ھجری بمطابق ۱۵۹۰ عیسوی میں ہوئی۔ اگرچہ ان کی املاک زیادہ تر کونسٹر میں تھی لیکن حضرت پیر باباؒ کے سجادہ نشین قرار پانے پر انہوں نے بونیر کے مقام شلبانڈی ہی میں سکونت اختیار کی اور اسی جگہ ۱۰۶۴ھ (بمطابق ۱۶۵۴ء) میں ان کی وفات ہوئی۔ انہیں شلبانڈی ہی میں سپرد خاک کیا گیا جہاں ان کا مزار مبارک زیارت گاہ خواص وعوام ہے طریقت کا سلسلہ انہی سے چلا اور وہ مریدوں کی باطنی تربیت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ یہ بات زبان زد عوام ہے کہ اخون درویزہ باباؒ کو ترقیات روحانی کا بڑا حصہ ان سے حاصل ہوا تھا۔ لیکن حقیقت میں انوار باطنی کا یہ حصّہ اخوند سالاک کو ملا تھا (لفظ اخوند سے بجائے سالاک کے درویزہ مشہور ہو گیا)

سید عبدالوہابؒ نے اپنے جداًمجد (پیر بابا) کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے کفار کوہستان کے خلاف جہاد کی مہم کا انتظام کیا۔ اس جہاد کی قیادت اخون سالاک نے کی۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو کوہستان سوات کے کفار کے خلاف سید قاسم کی نگرانی میں جہاد کا آغاز ہوا۔ سید حسن بھی اس مہم میں پیش پیش رہے۔ اس طرح کفار کی ایک کثیر تعداد دائرہ اسلام میں آگئی۔ کفار کا زور ٹوٹ گیا اور اسلام کا بول بالا ہوا۔ اس طرح ان حضرات نے سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کی وصیت پر عمل درآمد کرکے دکھا دیا۔

یہ عظیم کارنامہ بجا لانے پر سید عبدالوہاب اور ان کے برادرانِ گرامی میں سے ہر ایک کو "صاحب تیغ اور صاحب دیگ" کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو یہ حضرات جہاد بالکفار میں پیش پیش رہے اور دوسری طرف مریدوں اور عام مسکینوں لئے وسیع لنگر بھی جاری کیا۔ یہ دونوں ذمہ داریاں پوری کرنے پر مسلمان عوام ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔

سیدؒ جمالؒ ابن سیدؒ عبدالوہابؒ

سید جمال ابن سید عبدالوہابؒ کو بڑا بھائی ہونے کی حیثیت میں کونڑ کی جاگیر عطا ہوئی تھی اس لئے وہ وہیں سکونت پذیر رہے۔ اُن کے چھ بیٹے تھے جن میں سے بڑے صاحبزادے سید عباسؒ نے بڑا نام پایا...... کونڑ کی جاگیر انہی کی تحویل میں تھی اور سجادہ نشینی بھی انہی کے حصے میں آئی تھی...... لوگ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے...... کونڑ کے سادات ترمذی کی اکثریت انہی سید جمالؒ (یا جمال الدین اوّل) کی اولاد ہے جن میں سے سید عباسؒ بابوجان بادشاہؒ، سید محمود شاہ پاشاؒ، سید جمال الدین افغانیؒ، سید غلام باشاہ، سید میر جان صاحب پاشا عرف شیخ پاشاؒ بڑی نامور ہستیاں گذری ہیں...... یہ لوگ سارے علاقہ کے دُنیوی سربراہ بھی تھے اور دینی پیشوا بھی...... سید محمود شاہ پاشاہ کونڑ کے بادشاہ بھی رہے۔ اسی طرح سید جمال الدین افغانی (جو سید عباسؒ کی چوتھی پشت میں تھے) عالمی شہرت کے مدبر اور انقلابی رہنما تھے سید جمال الدینؒ کے والد سیدؒ صفدرؒ بھی خوبیوں کے مالک تھے۔

سید جمال الدین افغانیؒ کی حیات و تعلیمات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کی علمی قابلیت اور تدبر کی وجہ سے امیر دوست محمد خان نے انہیں مصاحب اور مشیر اور اپنے بڑے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر رکھا تھا۔ بعد میں افغانستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر انہیں وہاں سے ہجرت کرنی پڑی تو انہوں نے مصر، ترکی، ایران اور دوسرے ملکوں کا دورہ کر کے اتحاد بین المسلمین کی تحریک چلائی۔ انہوں نے مسلمانوں کو فرنگی سامراجیوں کی سازشوں سے بچنے کو کہا اور اسلامی ممالک میں سامراجیوں کے خلاف مسلمان عوام کو منظم کیا...... انہی کی کوششوں سے انقلابی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور مسلمان عوام میں جذبۂ حریت بیدار ہوا۔

مشہور انگریز مستشرق ای۔ جی براؤن کے الفاظ میں مفکر بھی تھے اور صاحب قلم

بھی، خطیب بھی اور صحافی بھی، سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسے بلند پایہ سیاستدان تھے جنہیں مسلمان بادشاہ اور فرنگی سامراج دونوں ایک خطرناک اور شورش پسند انقلابی سمجھتے تھے۔

سید شاہ مرتضیٰؒ

سید شاہ مرتضیٰؒ سید عباسؒ بن سید جمالؒ کے چھوٹے بھائیوں میں سے ہیں۔ ان کی ایک ہمشیرہ، جو زہد و تقویٰ میں رابعۂ وقت مشہور تھیں، کی شادی سید حسن گیلانی قادریؒ پشاوری سے ہوئی۔ اسی پاکباز خاتون کے بطن سے سید شاہ محمد غوث لاہوری علیہ الرحمتہ جیسی یکتائے زمانہ ہستی تولد ہوئی جن کا مزار اقدس دہلی دروازہ کے باہر لاہور میں ہے اور جن کا شمار بلند پایہ روحانی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ میاں سرکار سید حسن بادشاہ قادریؒ کا مزار پر انوار پشاور میں زیارت گاہ خواص و عوام ہے بی بی صاحبہ مذکورہ والدہ حضرت شاہ محمد غوثؒ و ہمشیرہ سید عباسؒ و شاہ مرتضیٰ ترمذیؒ، کا مزار شریف بھی سید حسن بادشاہ قادری گیلانیؒ کے مزار کے پہلو میں پشاور میں ہے۔

چونکہ سید شاہ مرتضیٰؒ کو کوٹھ کی جائیداد سے کوئی حصہ نہ ملا تھا اور وہ بونیر کی املاک کے حصہ سے بھی محروم تھے، اس لئے انہوں نے علاقہ گدون کے جدونوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ ہزارہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ یہ واقعہ ۲۰-۱۷۱۹ء کا ہوگا۔ اس سے قبل سید جلالؒ ابن سید قاسمؒ بن سید عبدالوہابؒ پکھلی کا علاقہ فتح کر چکے تھے (تفصیلی ذکر آگے آئے گا) ان دنوں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ وفات پا چکا تھا اور مغلیہ حکومت رُو بہ زوال تھی۔ پکھلی سرکار پر (جس میں اس وقت موجودہ ہری پور تحصیل کے میدانی علاقے بھی شامل تھے) سلطان محمود خورد حاکم تھا جو ترک کہلاتا تھا۔ ترک حکمران خانہ جنگی میں مبتلا تھے اور ایسے میں جگہ جگہ مختلف ترک سرداروں (مسلمانوں) کا تصرف تھا۔ سلطان محمود ترک کے مرتے ہی حالات مزید خراب ہوگئے۔ ترک حاکم اکثر ظالم بھی تھے، اور عیاشی

بھی، لہٰذا عوام بھی انہیں ناپسند کرتے تھے..... ترک سلطان زادے باہم مشت وگریبان رہتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں میں سلطان محمود خورد کے دو بھائیوں سلطان مقرب خان اور سلطان قیاس الدین زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ کافی عرصہ تک دونوں بھائی آپس میں لڑتے رہے، بالآخر سلطان مقرب خان والئی دھمتوڑ کا پلہ بھاری رہا اور قیاس الدین اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ سلطان مقرب خان بیحد سخت گیر انسان تھا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ لوگ اس کے خلاف وفد لے کر اورنگزیب عالمگیر کے پاس پہنچے جس نے ان کی دادرسی کے لئے سلطان مبارز الدین گکھڑ کو ہزارہ بھیجا۔ سلطان مقرب خان کے رشتہ دار اس سے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے اس لئے اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ دنوں تک تو سلطان مبارز الدین ہزارہ میں مقیم رہا۔ لیکن اس کی واپسی کے بعد حالات اور بھی خراب ہوگئے اور دھمتوڑ کا علاقہ سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان کے دو گھرانوں میں تقسیم ہوگیا۔

۲۰-۱۷۱۹ عیسوی میں ان دونوں گھرانوں کے مابین خانہ جنگی کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا اور ان کی برائے نام حکومت دم توڑتی نظر آنے لگی...... صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جدونوں نے سید شاہ مرتضیٰ کی قیادت میں ہزارہ پر حملہ کر دیا۔ وہ علاقہ گدون سے چل کر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہری پور پہنچے اور وہاں سے موجودہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے اس علاقے کے پٹھان قبائل سے کوئی تعرض نہ کیا البتہ ڈھونڈ، بمبے اور دوسری قوموں کو پہاڑوں کی طرف دھکیل کر میدانی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں وہ حویلیاں کے راستے رجوعیہ سے ہوتے ہوئے دھمتوڑ پہنچ گئے۔ ان دنوں سلطان اکبر خان دھمتوڑ کا آخری حاکم تھا۔" تاریخ ہزارہ" کے مصنف میجر ڈیس کے مطابق وہ انتہائی عیاش شخص تھا۔ اس کی عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ اس نے دھمتوڑ میں ایک تالاب بنا رکھا تھا جس میں مرد عورتیں اکٹھے نہایا

کرتے تھے۔

سید شاہ مرتضٰیؒ کی اولاد میں یہ بات مشہور ہے کہ جب جدون کا لشکر دھمتوڑ پہنچا تو سید شاہ مرتضٰیؒ کی اہلیہ محترمہ، جو نہایت صالحہ خاتون تھیں۔ ایک علیحدہ کمرے میں اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھ گئیں اور کافی دیر تک دعا کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے جدون لشکر کو یہ حیلہ تبلایا کہ رات کی تاریکی میں ایک شخص بیل پر دو بوریاں رکھ کر گزرے، بوریوں میں غلہ کی جگہ مٹی بھر دی جائے۔ جب وہ دھمتوڑ شہر کے وسط سے گزر جائے تو شہر کے آخری حصے میں پہنچ کر ایک فائر دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف کر کے خود بیل کو ہانکتا ہوا باہر نکل جائے۔ ان دو فائروں سے ترکوں کے دونوں گروہوں میں ایک دوسرے پر حملے کا شبہ کیا جانے لگا۔ تو وہ پہلے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اب رات ہی کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ساری رات باہمی کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا۔ صبح ہونے تک ان کے تقریباً سبھی لڑاکا لوگ ختم ہو چکے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صبح دم جدونوں نے شہر پر دھاوا بول دیا اور بغیر کسی خاص مزاحمت کے دھمتوڑ پر قابض ہو گئے۔

یہ ۱۷۰۲ عیسوی کا واقعہ ہے اس وقت جدون کا سربراہ نصیر خان پیر دخیل تھا۔ جبکہ لشکر کی قیادت سید شاہ مرتضٰیؒ کر رہے تھے۔ دھمتوڑ کی تسخیر کے بعد جدونوں نے علاقہ رش کے دیگر دیہات پر بھی قبضہ جما لیا۔ اس طرح بگڑہ۔ بالڈھیر، حویلیاں، رجوعیہ، دھمتوڑ سلہڈ، جھنگی، کاکول، نواں شہر، میرپور سے بانڈہ پیر خان کے تمام دیہات ان کے تسلط میں آ گئے۔

جب یہ مہم تکمیل پذیر ہو گئی تو باہمی معاہدے کے مطابق جدون نے مفتوحہ علاقہ کا ایک چوتھائی پسندیدہ حصہ سید شاہ مرتضٰیؒ کی خدمات کے عوض انہیں دے دیا۔ باقی ماندہ علاقوں میں سے جدون قوم کے قبیلوں سالار، منصور اور حسن زئی میں برابر برابر تقسیم

کردیئے گئے۔

اس حصہ رسدی کے علاوہ جدونوں نے پیر بابا کے شکرانہ کے طور ہر خرمن سے ایک صاع غلہ سید شاہ مرتضیٰ کی اولاد کو بخوشی دینا بھی منظور کر لیا۔ جدون قوم پیر بابا اور ان کی اولاد سے اتنی ارادت رکھتی تھی کہ غلہ میں سے یہ حصہ دینا بھی پیر بابا کی اولاد کے دائمی حق کے طور منظور کر لیا گیا۔ انگریز کی آمد پر ۱۸۷۰ء۔۷۲ء میں جب پہلا بندوبست اراضی عمل میں آیا تو بھی وفا شعار جدون قوم نے بندوبستی افسر میجر ویس کے سامنے متفقہ طور پر تحریری بیان دے کر پیر بابا کا نذرانہ مثلِ حقیقت میں درج کرا لیا اور سادات کی اراضی بھی مستقلاً انہیں دے دی گئی اور سادات کو اس اراضی کے رہن، بیع کرنے کا مجاز بھی قرار دے دیا گیا۔ خود میجر ویس نے جدون قوم کے اس ایفائے عہد، دیانتداری اور ایمانداری کو بہت سراہا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اس نے سید جلال بابا کی اولاد کے ساتھ صواتیوں کے طرزِ عمل کو اخلاقی بداعتمادی اور بددیانتی پر محمول کیا ہے۔

سید شاہ مرتضیٰ کو حسب تقسیم جو چوتھائی حصہ ملا تھا اس میں مواضعات میرپور اور جھنگی وغیرہ شامل تھے۔ تاہم ان کی اولاد کثرت سے علاقہ رش کے تمام دیہات (دھمتوڑ، نواں شہر، کاکول، شیخ البانڈی، جھنگی، میرپور وغیرہ) اور رجوعیہ، دکھن، بالڈھیری، بانڈی ڈھونڈاں، داتہ، الکھوڑہ اور بیرا خیر آباد میں آباد ہے۔

سید مسعودؒ بن سید عبدالوہابؒ

سید مسعودؒ بن سید عبدالوہاب چونکہ سید جلال کے علاوہ (جو کونش میں آباد تھے) باقی تمام بھائیوں میں بڑے تھے اور بونیر کی مرکزی گدی کے سجادہ نشین تھے۔ اس لئے انہیں تمام خاندان میں بڑی اہمیت حاصل تھی وہ اپنے والد ماجد کی طرح تمام افغانوں کے دنیوی اور روحانی پیشوا تھے۔ انہی کی تائید اور امداد سے ان کے عمزاد سید جلال بن سید قاسمؒ نے ضلع ہزارہ کا شمالی علاقہ فتح کیا (جس کا ذکر بعد میں آئے گا)۔

سید مسعودؒ کے تیرہ فرزند تھے جن میں سے سید خواجہ احمد نورؒ جو ایک عالم فاضل
انسان اور صاحب کشف و کمال بزرگ تھے۔ بہادر شیخ فدا بابا ان کی نویں پشت سے
سید ضامن شاہ ایک بہادر اور مدبر حکمران ہو گزرے ہیں۔ سید ضامن شاہ ہی تھے جنہوں
نے اپنا خاندانی مرکز بونیر سے تھانہ منتقل کیا اور محمد شاہ بادشاہ سے [illegible] جیلی
کی جاگیر کی سند حاصل کرکے علاقے کے حکمران بن گئے۔ ان کے پوتے سید اکبر شاہؒ نے مجاہدین
سید احمد بریلوی کی ہر ممکن مدد کی۔ سید اکبر شاہؒ کو بعد میں سوات اور ہزارہ کے مسلمان
عوام کے لئے امیر یا بادشاہ منتخب کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شہزادہ مبارک
شاہ بھی چھ ماہ تک سوات کے بادشاہ رہے۔ پھر اخون صاحب سوات کی ناراضگی کی وجہ سے
وہ اس منصب پر فائز نہ رہ سکے۔

سید مبارک شاہ کو انگریزوں سے شدید نفرت تھی۔ امبیلہ کی مشہور جنگ (۱۸۶۲ء)
میں وہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والے سرحدی مجاہدوں کے ہیرو تھے۔

سادات ستھانہ کے اس خانوادے میں پیر باباؒ کی بارہویں پشت میں ایک نہایت عالم
و فاضل ہستی سید عبدالجبار شاہ (۱۸۷۸ء – ۱۹۶۶ء) بھی ہوئے ہیں۔ وہ دو سال کے تھے کہ
گھرانے میں خانہ جنگی کے سلسلے میں قتل مقاتلہ ہوا تاہم اللہ نے اس یتیم بچے کو محفوظ رکھا۔ بچپن
میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعلیم پائی، ۱۸۹۹ء میں نواب امب محمد اکرم خان
نے انہیں اپنا مشیر بنا لیا، ۱۹۰۷ء میں نواب خانی زمان خان نے انہیں اپنا سیاسی وزیر مقرر
کیا۔ انہوں نے ریاست کو توسیع و ترقی دی۔ اپنے دشمنوں کو (جس میں سید فیروز شاہ بھی
تھا) مغلوب کیا مگر قتل نہ کیا، ۱۹۱۵ء میں انہیں لوگوں نے سوات کا بادشاہ منتخب کیا۔
تین سال بعد اس منصب سے معزول ہوئے تو دوبارہ نواب آف امب کے پاس وزیر رہے
۱۹۳۶ء تک اس عہدے پر مامور رہے اور پھر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ انہوں نے ایک
کتاب موسومہ بہ "عبرۃ لاولی الابصار" تصنیف کی ہے جس میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں

کے تاریخی حالات کے علاوہ حضرت پیر باباؒ کے بارے میں مفصل کوائف ملتے ہیں۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ سید عبدالجبار شاہ کے فرزندوں کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب میں بھی پیر باباؒ کے مصدقہ حالات کے سلسلے میں ان کی کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ یہ حالات کسی اور ذریعہ سے ملنے ناممکن تھے۔ شاہ صاحبؒ کا یہ کارنامہ فی الواقع قابل ستائش ہے۔

سیّد جلال بن سیّد قاسمؒ

سید جلالؒ اور مراد خان حالات سے مجبور ہو کر سوات سے نکلے اور کشمیر جانے کا عزم کیا۔ راستے میں کچھ عرصہ پکھلی کے صدر مقام گلی باغ میں قیام کیا۔ مراد خان کے ہمراہ اس کا ایک بھائی مسمی بھائی خان بھی تھا۔ جب سلطان محمود خورد والی پکھلی کو معلوم ہوا کہ کچھ معزز مہمان اس کے دارالسکومت میں آئے ہیں تو ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور انہیں بلا بھیجا۔ ان کے بے کسی اور پریشان حالی کا سن کر اور یہ معلوم کر کے کہ وہ حضرت پیر باباؒ کے بابرکت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترک سلطان محمود خورد نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ اپنے پاس ٹھہرایا اور یہاں تک کہ اپنی بیٹی سید جلال کے عقد میں دے دی اور جہیز میں بھوگڑمنگ کا علاقہ انہیں عطا کیا...... مراد خان کو اس نے اپنا مصاحب بنالیا اور اس طرح ان گردش زمانہ کے ستائے ہوئے لوگوں کو پھر سے پکھلی سرکار میں باوقار مقام حاصل ہو گیا۔

تاہم ترک سلطان محمود خورد کی سید جلال اور مراد خان پر یہ عنایت خسروانہ اس کے اپنے عزیز واقارب کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگی اور وہ موقع بموقع سلطان کے کان ان کے خلاف بھرنے لگے۔ ان کی باتوں میں آکر سلطان محمود سید جلال کو اپنی راہ کا روڑا سمجھنے لگا اور اپنی خفیہ پولیس کو حکم دیا کہ چپکے سے سید جلال کا کام تمام کر دیں۔ سید جلالؒ کو اس سازش کا کچھ علم نہ تھا۔ ایک دن وہ سلطان محمود سے ملنے بھوگڑمنگ سے گلی باغ آرہا تھا کہ سلطان کے مشنریوں نے ایک پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر اچانک حملہ کر دیا۔

سید جلال نے تلوار نکال لی اور مقابلہ کیا۔ لیکن اکیلے ان کی پیش نہ گئی۔ انہیں تلواروں اور نیزوں کے کئی زخم آئے۔ حملہ آور یہ سمجھ کر کہ وہ ختم ہو چکے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر چلتے بنے۔ زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود سید جلال نے حوصلہ نہ ہارا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے قلعہ تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ وفا شعار بیوی انہیں خون میں نہائے ہوئے دیکھ کر سارا ماجرا سمجھ گئی۔ اس نے انہیں قلعہ کے ایک کمرے میں لٹا دیا اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہی۔ تاہم اس نے کسی کو کانوں کان اس واقع کی خبر نہ ہونے دی نہ کسی کو سید جلال کے کمرے تک پہنچنے دیا۔ رفتہ رفتہ سید جلال کے زخم بھرتے گئے اور وہ صحت یاب ہو گئے...... سفر کے قابل ہوتے ہی وہ راتوں رات خفیہ طور پر پکھلی کے علاقے سے نکل کر اپنے عمّ زاد بھائی سید مسعودؒ کے پاس تختہ بند (بونیر) پہنچے اور امداد کے طالب ہوئے۔ سیدؒ مسعودؒ چونکہ پیر بابا کی مرکزی گدی کے جانشین اور صاحب جاہ و جلال تھے۔ اس لئے انہوں نے سید جلالؒ کی مظلومی کی داستان سن کر اسے ہر طرح کی امداد کا یقین دلایا۔ سید مسعود بڑے مدبر انسان تھے۔ یوسف زئی اور غوریا خیل ان کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان سواتیوں کو بھی جمع کیا جنہیں یوسف زئی اور دوسرے طاقتور قبیلوں نے اپنے علاقوں سے نکال دیا تھا اور وہ دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے سب کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ پکھلی پر چڑھائی کر دیں۔ اللہ نے فتح دی تو پکھلی کی حکومت سید جلال کے سپرد ہوئی جبکہ شکست خوردہ ترکوں کی تمام اراضی پر سواتی مالک و قابض قرار پائیں گے۔ اس پر سواتیوں نے دل و جان سے سید جلال کا ساتھ دیا۔

اُدھر پکھلی کے ترک حکمران اُس وقت باہمی خانہ جنگیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ سلطان محمود اپنے بھائی بندوں سے تنگ آ چکا تھا اور وہ ان کی شکایت کرنے شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے پاس دہلی گیا ہوا تھا۔ سارے پکھلی میں ترک باہم دست و گریبان تھے۔ علاقہ [illegible] میں سلطان لشکری اور سلطان رسالت خان ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے تھے۔

علاقہ تناول میں سلطان قیاس الدین (برادر سلطان محمود) اپنی من مانی کر رہا تھا۔ علاقہ مظفر آباد میں کمال خان خودسر ہو گیا تھا۔ گلی باغ میں سلطان محمود کے دو چھوٹے بیٹے مرید خان اور عاقل خان اپنے مشیر کار مراد خان کی رہنمائی میں لوٹ کھسوٹ میں لگے تھے، سلطان فاضل خان اور ملوک خان میدان ہزارہ قارلق کے کئی دیہات پر قبضہ جما چکے تھے، سلطان پو اور مانکرائے میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ اس طرح پکھلی کے ترک حکمرانوں نے طوائف الموکی مچا رکھی تھی۔ نہ کوئی مرکزی نظام تھا نہ وہ پکھلی سرکار سے دبتے تھے۔ سید جلالؒ چونکہ ایک عرصہ پکھلی میں وقت گزار چکا تھا اس لئے اس صورت حال سے بخوبی باخبر تھا۔ وہیں اس کے دیرینہ دوست مراد خان اور بھائی خان بھی موجود تھے۔ لہٰذا اس نے اپنے لشکر کو لے کر دریائے سندھ عبور کیا اور پکھلی کے قلب پر حملہ کر دیا۔ مراد خان نے دوست پروری کا ثبوت دیتے ہوئے سلطان مرید خان اور سلطان عاقل خان (وارثان شاہ محمود) کو جنگ سے باز رکھا اور چپکے سے قلعے سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ یہ شہزادے اپنی خواتین اور بچوں کو لے کر علاقہ کونش میں روپوش ہو گئے جس پر سید جلالؒ نے بغیر کسی مزاحمت کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ پر سید جلال کے قبضہ کی خبر سنتے ہی ترک لشکریوں نے گلی باغ چھاؤنی کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ اس لڑائی میں گلی باغ جل کر راکھ ہو گیا۔ پھر صواتی لشکر نے بھی گلی باغ اور بیداری میں خوب لوٹ مار مچائی۔ اس طرح ۱۷۱۳ء کو پکھلی سے ترک اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور دریائے سندھ کے مغرب اور مشرق دونوں طرف حضرت پیر باباؒ کے خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ مغرب میں سید مسعودؒ اور مشرق میں سید جلالؒ دینی پیشوا بھی تھے۔ تو دنیوی حکمران بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس فتح کے بعد حملہ آوروں میں کچھ تو انہی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ جبکہ کچھ واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

پکھلی کی فتح کے بعد سید جلالؒ اور مراد خان نے علاقے کی تقسیم کر لی۔ سید جلالؒ نے وادی کاغان اپنے پاس رکھی اور باقی علاقہ مراد خان کے تصرف میں دے دیا۔ یاد رہے کہ

کاغان کا علاقہ اس سے پیشتر پکھلی سرکار میں شامل نہ تھا۔ بعد میں سید جلالؒ کے فرزند ارجمند نے (جو غازی باباؒ کے لقب سے مشہور رہیں) کاغان کے نواحی کوہستانی علاقوں اور چیلاس کے کفار سے جہاد کیا اور نہ صرف ہزاروں لوگوں کو مشرف باسلام کیا بلکہ سارے علاقے میں اپنی عملداری قائم کرلی۔ ..... قبل ازیں دریائے سندھ کے مغربی کوہستانی علاقے چترال، دیر، کوہستان بونیر بھی پیر باباؒ اور ان کے خلفاء اور اولاد کے ہاتھوں فتح ہو چکے تھے۔ اب ہزاروں مربع میل پر پھیلے ہوئے ان تمام وسیع و عریض علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور لوگ دھڑا دھڑ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔

تاریخ ہزارہ کے مؤلف میجر ویس کے مطابق صواتیوں نے اپنے غلہ (خرمن) سے ایک چوتھائی حصہ سید جلالؒ اور ان کی اولاد کو دینے کا وعدہ کر رکھا تھا لیکن بعد میں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اس طرح نہ صرف وہ وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے بلکہ انہوں نے سادات کی املاک بھی ان سے چھین لی۔

سید جلال گلی باغ اور پکھلی کی تسخیر کے تھوڑا عرصہ بعد وفات پا گئے۔ ان کا مزار موضع ڈگ میں اب بھی زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔

حضرت پیر باباؒ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی برکات سے نوازا درہ کاغان پکھلی اور اگرور وغیرہ کے سادات زیادہ تر انہی کی پشت سے ہیں۔ انہوں نے دین کا پرچم بلند کئے رکھا اور مقامی لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ علاوہ ازیں دنیوی وجاہت اور امارت میں بھی انہیں وافر حصہ ملا۔ وہ بڑی بڑی جاگیروں اور املاک کے مالک رہے۔ ان میں سے کئی لوگ سجادہ نشین اور رہنمائے طریقت بھی رہے۔ جبکہ دوسرے لوگ جہاد آزادی میں حصہ لینے اور اپنی صلاحیتوں کی بناء پر بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔ سارے علاقہ میں آج بھی انہیں انتہائی عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

سید پائندہ شاہ المعروف چٹری باباؒ

سید پائندہ شاہ المعروف چٹری باباؒ

علیہ الرحمتہ حضرت پیر بابا کی گیارہویں پشت میں سے ہیں، ان کی ساری زندگی بھی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف رہی۔ جس طرح خود پیر بابا علیہ الرحمتہ نے اپنے مرشد گرامی کی ہدایت پر اپنے آپ کو کوہستانی علاقوں میں تبلیغ دین کے لئے وقف کر دیا۔ اسی طرح ان کی اولاد بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دور دراز کے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں آباد ہوئی۔ اس خانوادے کے ایک عظیم فرد سید محبوب شاہؒ نے اسی سلسلہ میں موضع خوازہ خیلہ رسوام کو اپنا مسکن بنایا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے کا مشن جاری رکھا۔ بعد میں ان کے صاحبزادے سید مبارک شاہ صاحبؒ نے بھی تبلیغ دین کی خاطر شانگلہ پار کے ایک چھوٹے سے گاؤں غوربند میں سکونت اختیار کر لی۔ سید محبوب شاہؒ اور سید مبارک شاہ دونوں کے مزارات اسی موضع غوربند میں موجود ہیں......

حضرت سید پائندہ شاہ المعروف چیڑی باباؒ اسی مقام پر سال ۱۲۶۳ھجری (بمطابق ۱۸۴۷ء) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ان میں ولایت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ دنیا سے لاتعلق اور اللہ اور رسولؐ کی محبت میں مست و سرشار رہتے۔ چونکہ یہ گھرانا ظاہری اور باطنی علوم دونوں میں ممتاز مقام کا مالک رہا ہے۔ اس لئے اپنی خاندانی روایت کے مطابق سید پائندہ شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی جو ایک نامور عالم دین اور مدرس تھے اور جن سے ہزاروں طالبان دین نے اکتساب فیض کیا۔ فقہ کی ابتدائی کتابیں اپنے برادر بزرگ سے پڑھنے کے بعد سید پائندہ شاہ کچھ عرصہ بغرض تعلیم سوات میں بھی مقیم رہے۔ حصول علم کے ساتھ ساتھ وہ ذکر و فکر الہٰی میں مصروف رہتے۔ اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے جب بھی موقع ملتا اپنے جدامجد، سلطان الاولیا، غوث زمان حضرت پیر بابا علیہ الرحمتہ کے مزار شریف پر حاضری دیتے اور کئی کئی دن وہاں قیام کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، اکثر وہیں پر چلہ کشی بھی کیا کرتے..... ایک بار تو پورے ڈیڑھ سال تک انہوں نے پیر باباؒ کے مزار پر چلہ کاٹا...... اس چلہ کے دوران خواب میں انہیں اعلیٰ حضرت

پیر باباؒ کی زیارت نصیب ہوئی جنہوں نے سید پائندہ شاہ کو تاکید کی کہ وہ اپنے بزرگوں کے طریقے کو قائم رکھیں...... اور کوہستان کے دور دراز علاقوں میں لوگوں کے اصلاح احوال پر توجہ دیں۔ ان دنوں کوہستانی علاقوں میں بدامنی اور قتل و غارت کا دور دورہ تھا اور لوگ اسلامی تعلیمات سے بالکل ناآشنا تھے۔

اپنی روحانی پاکیزگی کی بدولت حضرت چیڑئی باباؒ کو اپنے علاقہ میں بھی بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دور دراز علاقوں کے علمائے کرام بھی بعض مسائل کے حل کے سلسلے میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کوہستان کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکان وفد نے ان سے استدعا کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ان کے ہاں تشریف لے جائیں تاکہ لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں مدد ملے۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ وہ حضرت کے ارادت مندوں اور مہمانوں کے لئے رہائش اور لنگر کا انتظام بھی کرنے کو تیار ہیں۔ حضرت چیڑئی بابا ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ وہی کوہستانی علاقہ ہو جہاں جانے کی تاکید حضرت پیر باباؒ نے انہیں خواب میں کی تھی۔ آپ نے اس بارے میں اپنے عزیز و اقارب سے بھی مشورہ کیا اور بالآخر اس کوہستانی علاقہ کو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس علاقہ کا نام چیڑائی ہے۔ یہ خطہ چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سطح سمندر سے سات آٹھ ہزار فٹ اونچا ہونے کی وجہ سے موسم سرما میں یہاں بہت برف پڑتی ہے جو کئی کئی ماہ تک پہاڑی چوٹیوں پر جمی رہتی ہے۔ بعض اوقات برفانی تودے گلیشیر کی صورت میں پہاڑوں سے سرک آتے ہیں تو سارے علاقے میں سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور آمد و رفت رک جاتی ہے۔ گلیشیر کے گرنے کی آوازیں بڑی ہیبت ناک ہوتی ہیں۔ چونکہ اس سیلاب کو پشتو میں چیڑئی کہا جاتا ہے اس لئے اس سارے علاقے کا نام بھی چیڑئی پڑ گیا ہے اور علاقے کی مناسبت سے سید پائندہ شاہ صاحبؒ کو بھی چیڑی باباؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سید پائندہ شاہ باباؒ کے وہاں جانے سے لوگوں میں پھر اسلامی جوش اور جذبہ عود کر آیا۔ اپنی تبلیغ اور اپنے نفس گرم سے انہوں نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی، لوگ ان کے ظاہری اور باطنی علوم سے فیض یاب ہوئے۔ بدامنی کی جگہ امن نے اور فضولیات کی جگہ اعلیٰ اخلاقی قدروں نے لے لی۔ آپ کے ہاں روزانہ ختم خواجگان پڑھا جاتا اور ذکر و فکر کی مجلسیں برپا ہوتیں۔

پچاس برس کی عمر تک آپ ہمہ تن تبلیغ دین کی طرف متوجہ رہے اور تجرّد کی زندگی بسر کی۔ پھر سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی غرض سے مشہور ولی اللہ، عالم دین اور پشتو شاعر حافظ الپوریؒ کی ایک نواسی سے جو انتہائی پاک دامن خاتون اور حافظ قرآن پاک تھی، نکاح کیا۔ آپ کی عادت تھی کہ اکثر حضرت پیر باباؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے تھے۔ چوراندے سال کے تھے کہ خواب میں حضرت پیر باباؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ مزار مبارک سے ملحقہ مسجد کی تعمیر نو کرائیں اور اس کی تزئین و آرائش کی جانب متوجہ ہوں۔ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے چیڑی بابا کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ یہ کام انجام دیں تاہم چونکہ اپنے جدّ امجد (پیر باباؒ) کا فرمان بجا لانا ضروری تھا۔ اس لئے وہ ۱۹۳۸ء میں بونیر آئے، تمام سادات کرام اور معززین علاقہ کا بہت بڑا جرگہ بلایا اور ان سے مسجد کی تعمیر نو کے لئے تعاون کی درخواست کی۔ تمام لوگوں نے ان کی اپیل پر آمنا و صدقنا کہا۔ چونکہ ان دنوں سوات اور بونیر میں ریاستی نظام تھا اس لئے آپ والیٔ سوات میاں گل عبدالودود صاحب کے پاس اجازت لینے سیدو شریف گئے۔ والی صاحب بھی حیران ہوئے کہ اس ضعیفی اور بے سرو سامانی میں ان سے اتنا بڑا کام کیسے انجام پائے گا۔ تاہم چیڑی باباؒ نے کہا "منصوبہ کی تکمیل اللہ تعالیٰ خود کرے گا۔ مسجد انشاء اللہ ضرور بنے گی، آپ حاکم وقت ہیں، اجازت ضروری ہے۔ آپ صرف اجازت نامہ لکھ دیں"۔ بادشاہ صاحب سوات نے نہ صرف اجازت نامہ لکھ دیا بلکہ اپنے کارکنوں کو بھی آپ کی مدد کے لئے بھیجا۔ ۱۹۴۰ء میں اس عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی ..... یہ وہ دن تھے جب

دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے سیمنٹ، سریا اور دوسرا عمارتی سامان دستیاب ہونا بیحد مشکل تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت چٹری باباؒ کی برکت اور ان تھک کوشش سے تعمیری کام جاری رہا۔ ابھی دو بڑے میناروں پر کام ہو ہی رہا تھا کہ چٹری باباؒ علیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ سیدو شریف کے ہسپتال میں ان کا علاج ہوتا رہا لیکن بالآخر موت کا بلاوا آگیا اور ۱۳۶۸ھ میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہو کر اپنے مولائے حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔

حضرت چٹری باباؒ کا مزار اس رفیع الشان مسجد کے مشرق میں واقع ہے جو اپنی تعمیر کے لحاظ سے بڑا خوبصورت اور دلکش ہے، ہر روز سینکڑوں لوگ وہاں حاضری دیتے اور سلام پیش کرتے ہیں۔

حضرت چٹری باباؒ کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین حضرت سید معین الدین شاہ صاحب نے مسجد کی تعمیر و تزئین کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے حضرت پیر باباؒ کے روضہ کی توسیع و آرائش میں بھی گہری دلچسپی لی اور مزار سے ملحق ایک دینی درس گاہ بھی تعمیر کرائی۔ درسگاہ ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں ہر وقت ساٹھ ستر طلبائے دین تعلیم پاتے ہیں۔ ان کی خوراک رہائش اور اساتذہ کرام کے مشاہروں کا اہتمام درگاہِ پیر باباؒ کے سجادہ نشین حضرات برداشت کرتے ہیں۔ زائرین کرام اور نادار مسافروں کے لئے لنگر شریف کا بھی انتظام ہے۔

اسی سال ۱۹۸۶ عیسوی (بمطابق ۱۴۰۶ھ) کو سید معین الدین شاہؒ بھی انتقال فرما گئے تو ان کی جگہ ان کے بڑے صاحبزادے سید حسین شاہ صاحب طال اللہ عمرہٗ کو درگاہ پیر باباؒ سید علی غواص ترمذی علیہ الرحمتہ کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا۔ اس طرح چار سو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے لیکن اللہ کے ایک نیک بندے اور عظیم روحانی پیشوا حضرت پیر باباؒ کا جاری کیا ہوا مشن کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

پیرا بیبیؒ بی بی مریم ملیزئیؒ المعروف پیرا بیبی نہایت پرہیزگار، پاک دامن عابدہ اور صالحہ خاتون تھیں۔ وہ بڑی مستجاب الدعوات اور عظیم ہستی تھیں۔ ان کا مزار

حضرت پیر باباؒ کے مزار سے جنوب کی طرف تقریباً تین میل کے فاصلے پر پیر بابا ڈگر روڈ کے کنارے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ حضرت پیر باباؒ کے سلام کو جانے والے اکثر زائرین وہاں بھی حاضری دیتے اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

پیر باباؒ کے مزار کے اردگرد کافی آبادی ہے ہوٹل اور دکانیں ہیں۔ مزار مبارک تک سڑکیں پکی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام ہے۔ اسی لئے زائرین کو کوئی تکلیف پیش آنے نہیں پاتی۔

مختصر شجرۂ اولاد

سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا (بونیری)

- سید مصطفےٰ (کونڑ)
  - سید عبدالوہاب
    - سید جمال
      - سید عباس
      - شاہ سید مرتضیٰ (فاتح ہزارہ)
      - (بی بی)
    - سید مسعود
      - سید خواجہ نور
    - سید اسحاق
      - سید باقی
    - (ان سے کاکا گیل آگے چلے)
  - سید قاسم
    - سید جلال (فاتح پکھلی)
      - سید زمان شاہ (کاغان)
    - (ان سے کاکا خیل آگے چلے)
  - سید حسن
    - سید یوسف
      - میا عیسیٰ
      - سید نور
    - سید حسین
      - سید ابدال وغیرہ
- سید حبیب (لاولد) (ان کا مزار پیر بابا کے مزار مبارک کے پہلو میں ہے)

ان کی اولاد میں سید پائندہ شاہ و سید معین الدین باچا سجادہ نشین دربار پیر بابا ہوتے ہیں۔

ان کی اولاد سے سید اکبر شاہ وغیرہ بادشاہ صوات و ہزارہ ہوگئے ہیں

یہ خاتون زہد و عبادت میں نابغہ عصر مشہور تھیں حضرت سید حسن بادشاہ گیلانی قادری کی زوجہ اور حضرت شاہ محمد غوث لاہوری کی والدہ تھیں - ان کا مزار پشاور میں حضرت سید حسن گیلانی المعروف میراں سرکار کے مزار مبارک کے پہلو میں مرجع خلائق تھے

ان کی اولاد کا سلسلہ چار بیٹوں سید عبدالقادر المعروف صاحبزادہ بابا، سید جلال، سید علی المعروف شاہ جی بابا، سید ولی سے جاری ہے اور تمام ہزارہ خصوصاً ضلع ایبٹ آباد میں کثیر تعداد میں پھیلی ہوئی ہے

ان کی اولاد کثرت سے افغانستان (کونڑ وغیرہ) میں آباد ہے - بڑی بڑی صاحب علم و فضل و صاحب وقار ہستیاں ان میں گذری ہیں سید محمود شاہ وغیرہ بادشاہ ہوتے ہیں - انہی میں نابغہ عصر سید جمال الدین افغانی بین الاقوامی شہرت کے حامل ہوئے ہیں۔

باب ۹

سلاسل طریقت

سلاسل طریقت اعلیٰ حضرت غوث زماں سید علی ترمذی (پیر بابا) چودہ خانوادوں اور سلسلہ جات طریقت میں شرف اذن وارشاد سے ممتاز تھے جن میں سلسلہ کبرویہ[1] وسلسلہ قادریہ[2] کی اذن واجازت اپنے جد بزرگوار حضرت سید احمد نور علیہ الرحمتہ سے حاصل ہوئی تھی اور باقی سلسلہ جات جو باہم دیگر پیوستہ ہیں۔ ان کی اجازت حضرت شیخ سالار عطار اللہ رومی علیہ الرحمتہ سے ملی تھی۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

چشتیہ[3]، سہروردیہ[4]، شطاریہ[5]، ناجیہ حلاجیہ[6]، زیدیہ[7]، ادھمیہ[8]، الوہریہ[9]، عجمیہ[10]، داودیہ[11]، کرخیہ[12]، سقطیہ[13]، اور فردوسیہ[14]

چار مشہور سلاسل (چشتیہ، سہروردیہ، کبرویہ وقادریہ) کے شجرہ جات درج ذیل ہیں۔

شجرہ سلسلہ چشتیہ

الٰہی بحرمت سیدنا ومولانا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الٰہی بحرمت سیدنا اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ عبد الواحد بن زید رحمتہ اللہ علیہ

الہٰی بحرمت حضرت خواجہ فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ سلطان ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ حُذیفہ مرعشی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ہبُیرہ بصری رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ احمد ابدال چشتی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابو محمد چشتی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ غریب نواز سید معین الدین سنجری (اجمیری) چشتی رحمتہ اللہ علیہ۔
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی (کاکی) رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ سراج الدین رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ علاؤ الدین عمر اسد اللہ نوری رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ نور قطب عالم رحمتہ اللہ علیہ
الہٰی بحرمت حضرت خواجہ حسام الدین رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید حامدالدین رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ بہاؤ الدین ساحت رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سالار عطاء اللہ رومی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت شہنشاہ خراسان غوث زمان اعلیٰ حضرت سید علی غواص ترمذی

(پیر بابا) رحمتہ اللہ علیہ

سلسلہ سہروردیہ

الٰہی بحرمت سیدنا وشفیعنا ومولانا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

الٰہی بحرمت سیدنا باب مدینہ علم حضرت علی کرم اللہ وجہہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ مشاد علو دینوری رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ احمد اسود علو دینوری رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ محمد عمویہ بن عبداللہ سعد سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ وجیہ الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ صدرالدین عارف رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ رکن الدین رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید جلال الدین مخدوم جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ
الٰہی بحرمت حضرت خواجہ فخرالدین محبوبی رحمتہ اللہ علیہ
الٰہی بحرمت حضرت خواجہ نظام الدین مہاجری رحمتہ اللہ علیہ
الٰہی بحرمت حضرت خواجہ قطب الدین مہاجری رحمتہ اللہ علیہ
الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سالا عطاء اللہ رومی رحمتہ اللہ علیہ
الٰہی بحرمت غوث زمان شہنشاہ خراسان حضرت سید علی غواص ترمذی المعروف پیربابا (ربونیری) رحمتہ اللہ علیہ۔

سلسلۂ کبرویہ

الٰہی بحرمت سیدنا وشفیعنا ومولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
الٰہی بحرمت سیدنا اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام علی زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ص۱
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ
الٰہی بحرمت سیدنا حضرت امام علی رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ص۱ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقشبندیہ سلسلہ بھی جاری ہے جس کا فیض ان کو اپنے نانا حضرت قاسم بن محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہم سے اور ان کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اور ان کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کو حضرت رسالتمآب سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنچا تھا۔

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو علی رود باری رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو علی کاتب رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو بکر نساج رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ احمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو نجیب عبد القاہر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ عمار یاسر رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ نور الدین عبد الرحمان رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ رضی الدین علی لالا رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ بہاؤ الدین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ محمود مزدقانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ امیر کبیر علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابو اسحاق ختلانی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید نور بخش ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید یوسف نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ سید احمد نور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ خواجگان شہنشاہ خراسان غوث زمان سید علی غواص ترمذی المعروف پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ

سلسلہ قادریہ

الہیٰ بحرمت سیدنا وشفیعنا ومولانا سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

الہیٰ بحرمت سیدنا باب مدینہ علم حضرت علی کرم وجہہ

الہیٰ بحرمت سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت سیدنا حضرت سید حسن المثنیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید عبداللہ المحض رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید موسیٰ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت داؤد امیر محمد اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید محمد رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید یحییٰ زاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت سید ابو صالح موسیٰ جنگی دوست رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب رحمۃ اللہ علیہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ عمار یاسر رحمۃ اللہ علیہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ

الہیٰ بحرمت حضرت خواجہ رضی الدین علی المعروف بہ لالا رحمۃ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت احمد جرجانی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ نور الدین کبریٰ رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ علاء الدولہ سمنانی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ محمود مزدقانی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید امیر کبیر علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ ابواسحاق ختلانی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید محمد نور بخش ترمذی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ سید یوسف نور ترمذی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت حضرت خواجہ احمد نور ترمذی رحمتہ اللہ علیہ

الٰہی بحرمت خواجہ خواجگان غوث زمان اعلیٰ حضرت سید علی غواص ریبر بابا ترمذی۔ قدسنا اللہ بسرہ السامی۔

یا الٰہی از بلیات جہاں محفوظ دار، ہم بحب این بزرگان قلب را محفوظ دار (آمین) اللہ تعالیٰ ہمیں ان صوفیائے حقانی وعلمائے ربانی کی تعلیمات پہ عمل کرنے اور ان کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی زندگیاں قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ دراصل دین اسلام سراسر حبیب حق تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کما یلیق بشانہ الاعلیٰ کی اتباع کا نام ہے۔ اتباع بہ کمال، حضور ؐ کی محبت میں کمال سے حاصل ہوتا ہے۔ ایمان کی علامت اللہ اور رسول ؐ کی محبت ہے۔ قرآن پاک میں مومنوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ) (مومنوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ گہری ہوتی ہے) اس محبت یعنی پختہ ایمان کے حصول کے لئے بھی خود حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمایا کہ تم اعلانیہ لوگوں سے کہہ دو (قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ) کہ اگر تم

اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ یعنی سچے مومن بننا چاہتے ہو تو میری اتباع و پیروی کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا یعنی اس طرح تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ نیز یہ بھی فرمایا (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ) رسول کا اسوہ حسنہ تمہارے لئے یقیناً مشعل راہ ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں حضورؐ کی پیروی کے لئے راہنمائی نہ مل سکے۔ عبادات ہوں یا معاملات، معاشیات ہوں یا عمرانیات۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ہر شعبۂ زندگی میں آپ کے فرمودات قولاً و فعلاً ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ فرائض عبادات نماز۔ روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ بھی وہی اللہ کے ہاں مقبول ہیں جو حضورؐ کی اتباع اور آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر کئے جائیں۔ یہی حال واجبات۔ سنن اور نوافل کا ہے۔ کوئی عبادت جو خلاف طریقہ رسول یعنی خلاف سنت ہو وہ مقبول و محمود نہیں۔ حضور اکرمؐ کی محبت و اطاعت دراصل اللہ کی محبت و اطاعت ہے اور حضور کے اہل بیت و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت و اتباع بھی رسولؐ کی محبت و اتباع کا ثمرہ ہے۔ اسی طرح نائبان رسول علمائے راسخین اولیائے کرام کی محبت بھی اللہ و رسول کے لئے ہی ہے۔ یہ سب محبتیں آپس میں مربوط اور لازم ملزوم ہیں یہی ثمرۂ شریعت ہے۔ طریقت و حقیقت اس کے دو خادم بلکہ یہ دونوں شریعت کے دو پر ہیں جب سالک مومن شریعت پر چل کر طریقت و حقیقت کے پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے تو معرفت الٰہی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی اعلیٰ حضرت پیر بابا (قدس سرہ العزیز) کا نظریہ ہے۔ اپنے صالح بندوں کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ (الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ) اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حال میں یاد کرتے ہیں۔ اسی دوام ذکر و یاد الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے مشائخ طریقت کی صحبت اور ان کے بتلائے ہوئے اذکار و وظائف اور مراقبات کی پابندی کی جاتی ہے۔

فرائض کی پابندی اور محرمات سے بچنا ایک لازمی امر ہے یہ بھی ذکر اور یاد الٰہی

میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حضور پُرنور شافع یوم نشورؐ سے ہمہ تن یادِ الٰہی کے حصول کے لئے ہر موقع و محل کے مطابق بے شمار دعائیں منقول ہیں جن کا پڑھنا ایک طرف اتباعِ سنت پر عمل پیرا ہو کر اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف اُن کے پڑھنے پر جس ثواب اور اجر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ حاصل ہونے کی قوی اُمید ہے یہی بزرگانِ کرامؒ کا معمول ہے اور اسی کی تاکید اور تلقین وہ فرماتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند ایک دعائیں جو مختصر بھی ہیں اور جن کا اجر اور ثواب بھی بہت زیادہ ہے جو مومنین کے ساتھ حضور رحمۃ للعالمین کی انتہائی شفقت، رحمت اور رأفت کا صلہ ہے۔ عوام کے فائدہ کے لئے درج کی جاتی ہیں تاکہ ان کا وظیفہ باعثِ خیر و برکت ہو۔

(۱) بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

(ف صبح و شام تین تین بار پڑھنے والا ہر آفتِ ناگہانی سے محفوظ رہتا ہے)

(۲) رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

(ف۔ صبح و شام تین تین بار پڑھنے والے کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اسے راضی و خوش کر دے)

(۳) اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِىْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَىَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِىْ فَاغْفِرْلِىْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ ۝

(ف۔ اس کو سید الاستغفار کہتے ہیں۔ جو شخص یقین کامل کے ساتھ دن یا رات میں یہ دعا پڑھے۔ اگر اس دن یا رات میں فوت ہو جائے تو یقیناً جنتی ہوگا۔ لہٰذا

اسے صبح وشام ایک ایک بار پڑھ لینا چاہیئے۔

(۴) اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ہ تین بار پڑھ کر سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں (بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ج ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ہ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج

اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ط سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِیُٔ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہ) پڑھے۔

(ف۔ اگر کوئی شخص صبح پڑھے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے مقرر فرما دیتا ہے جو پڑھنے والے کے لئے شام تک بخشش اور رحمت کی دعا کرتے ہیں اگر وہ اس دن فوت ہو جائے تو شہید مرے گا۔ اور جو شام کو یہ پڑھ لے گا۔ یہی درجہ نصیب ہوگا۔ لہٰذا صبح وشام یہ وظیفہ پڑھنے کا معمول بنا لینا چاہیئے)

۵۔ صبح: اَللّٰھُمَّ مَآ اَصْبَحَ بِیْ مِنْ نِّعْمَۃٍ اَوْ بِاَحَدٍ مِّنْ خَلْقِکَ فَمِنْکَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ فَلَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ ہ

شام: شام کو اس دعا میں "مَآ اَصْبَحَ" کی بجائے "مَآ اَمْسٰی" پڑھے

(ف۔ یہ دعا جو شخص صبح کو پڑھنے تمام دن کی نعمتوں کا شکر ادا ہو جائے گا اور شام کو پڑھنے سے تمام رات کی نعمتوں کا شکر ادا ہو جائے گا)

۶۔ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ ہ

(ف۔ کسی مجلس سے اٹھ کر جانے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے۔ اس سے

مجالس میں ناروا گفتگو کرنے یا سننے کی برائی اور گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے)

۷- لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ

(ف) جو شخص یہ کلمات بازار میں پڑھے گا۔ اسے دس لاکھ نیکیاں ملیں گی دس لاکھ گناہ معاف ہوں گے۔ اور دس لاکھ درجے بلند ہوں گے اور جنت میں اس کے لئے ایک محل تیار ہوگا۔

۸- اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ؕ

ف۔ صبح و شام تین تین بار پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر مخلوق خصوصاً زہریلے اور موذی جانوروں کی ایذا اور شر سے بچائے گا)

۹- اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَ الْكَسَلِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَ الْبُخْلِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَ مِنْ قَهْرِ الرِّجَالِ

(ف) اگر کسی پر قرض ہو یا کسی اور دنیاوی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہو تو یہ دعا صبح و شام پڑھے (ماخوذ مشکوٰۃ شریف اور حصن حصین)

(۱۰) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ؕ وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ؕ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ؕ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ ؕ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؕ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ ؕ

ف آیت مبارک "لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اسی مالکِ حقیقی کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمینوں کی کنجیاں ہیں) کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ کنجیاں کیا ہیں تو آپ نے یہ کلماتِ مبارکہ بیان فرمائے۔ لہٰذا ان کا صبح وشام دس دس بار پڑھنا بے شمار دنیاوی و اخروی فوائد کا موجب ہے)

(فرمودہ اعلیٰ حضرت قاضی محمد صدرالدین نقشبندی مجددی)

درود شریف کے فضائل تو ان گنت ہیں اور اہلِ محبت نے اس کے بے شمار صیغے بیان کئے ہیں۔ ذیل میں ایک درود شریف جسے درود ناریہ یا تفریجیہ قرطبیہ کہتے ہیں۔ درج ہے اسے روزانہ گیارہ، اکتالیس یا سو بار پڑھنا بہت سے دنیاوی و اخروی فوائد کے حصول کا ذریعہ ہے

اَللّٰهُمَّ صَلِّ صَلٰوةً كَامِلَةً وَسَلِّمْ سَلَامًا تَامًّا عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الَّذِىْ تَنْحَلُّ بِهِ الْعُقَدُ وَتَنْفَرِجُ بِهِ الْكُرَبُ وَتُقْضٰى بِهِ الْحَوَائِجُ وَتُنَالُ بِهِ الرَّغَائِبُ وَحُسْنُ الْخَوَاتِمِ وَيُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ فِىْ كُلِّ لَمْحَةٍ وَّنَفَسٍ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ ٥

(ماخوذ از مجموعہ درود شریف۔ تاج کمپنی حوالہ ۴۳۹)

۱۰

شجرہ نسب کا جائزہ

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، ایک صاحب علم وفضل ادیب، ماہر النساب اور اولیاء کرام وسادات سے گہری محبت رکھنے والے ہیں، انہوں نے اعلیٰ حضرت پیر باباؒ کے تفصیلی حالات پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس کہ ان کی ضعیف العمری اور حوادثاتِ زمانہ نے ان کو اس کارِ خیر کی تکمیل کا موقع نہ دیا، صرف ایک مقدمہ اور شجرہ پر تبصرہ لکھ سکے، اللہ تعالیٰ ان کی امداد فرمائے تاکہ ان کی معلومات کا ذخیرہ منصۂ شہود پر آجائے۔ اعلیٰ حضرت پیر باباؒ علیہ الرحمتہ کے شجرہ نسب پر جو تحقیقی معلومات جناب قاضی صاحب موصوف زَادَ اللہ شَرَفَہٗ نے فراہم کی ہیں ان کا مطالعہ قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، لہٰذا ان کی بحث نقل کی جاتی ہے۔

"حضرت شیخ الاسلام والمسلمین سید السادات علی ترمذی المعروف پیر باباؒ علیہ الرحمتہ کا شجرہ نسب آپ کے نامور خلیفہ مولانا عبدالرشید الملقب بہ اخوند درویزہؒ نے اپنی تالیف تذکرۃ الابرار والاشرار (صفحہ ۱۲۴ مطبوعہ پشاور) میں اس ترتیب سے درج کیا ہے۔ سید علی ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ترمذی ابن سید احمد ہنیم ابن سید براق ابن سید احمد مشتاق ابن سید شاہ ابوتراب ابن سید حامد ابن سید محمود ابن سید اسحاق ابن سید عثمان ابن سید جعفر ابن سید عمر ابن سید محمد ابن سید حسام ابن سید شاہ ناصر خسرو ابن

سید جلال گنج علم ابن سید امیر علیؒ ابن سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید محمد مہدی ابن حضرت امام حسن عسکری ابن حضرت امام علی نقی ابن حضرت امام محمد تقی ابن حضرت امام علی رضا ابن حضرت امام موسیٰ کاظم ابن حضرت امام جعفر صادق ابن حضرت امام محمد باقر ابن حضرت امام علی زین العابدین ابن حضرت امام حسین سید الشہداء رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

سطور بالا میں جو شجرہ نسب درج کیا گیا ہے یہی اعلیٰ حضرت پیر باباؒ کی نسل کے اکثر سادات کے شجروں میں موجود ہے اور بعد کے آنے والے سوانح نگاروں نے بھی اسے لفظ بہ لفظ اسی طرح نقل کیا ہے یہاں تک کہ خود راقم الحروف (عبدالحلیم اثر افغانی) نے بھی اپنی تالیف "روحانی رابطہ" میں یہی شجرہ مندرجہ بالا ترتیب و تفصیل سے درج کیا ہے۔ لیکن اس شجرہ کے بعض نام جس طرح درج کئے گئے ہیں، ان میں چند ایک اشکالات و التباسات موجود ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کرنا اور ان کی وضاحت ضروری ہے۔

ا۔ پہلی بات یہ کہ آپ کے اجداد میں تین نام اس طرح لکھے گئے ہیں (سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ترمذی) حالانکہ اس میں آخری نام صحیح طور پر یوں لکھنا چاہیئے تھا (سید محمد نور، نور بخش یا محمد نور الملقب بہ نور بخش) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جلیل القدر سید نے سرزمین ایران میں تصوف کے ایک نئے سلسلے کو فروغ دیا تھا جس کو سلسلہ نور بخشیہ کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ "سید محمد نور بخش ترمذی سلسلہ کبرویہ کے جلیل القدر بزرگوں میں سے تھے اور بعد ازیں سلسلۂ نور بخشیہ کے بانی بھی تھے۔ آپ کے اس سلسلہ نور بخشیہ کو خراسان و ایران میں بڑی مقبولیت حاصل رہی تھی اور اس مبارک تصوفی مسلک کے آثار اب بھی سرزمین ایران میں موجود ہیں" چنانچہ اس پس منظر کی رو سے آپ کا پورا نام یوں لکھنا چاہیئے۔" سید محمد نور۔ نور بخشؒ[1]

---

[1] متعدد کتب اور سلسلہ ہائے طریقت میں آپ کا اسم گرامی سید نور بخش ترمذی ہی درج ہے البتہ سلسلہ نور بخشیہ کے بانی ضرور کہلاتے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ (۱) خود راقم الحروف کی تالیف روحانی رابطہ (صفحہ ۴۳۲)
(ii) ایک ہم عصر مؤلف اعجاز الحق قدوسی کی تالیف تذکرہ صوفیائے سرحد (صفحہ ۵۶)
(iii) حضرت مولانا الشیخ اخوند درویزہؒ کی تالیف تذکرۃ الابرار والاشرار (صفحہ ۱۲۵)
(iv) جناب مولانا علامہ سید محمد امین گیلانی خوگیانی (افغانستان) کی تالیف "مقدمہ بہ تاریخ الافغان (موئلفہ سید جمال الدین افغانی طبع کابل صفحہ ۶) میں حضرت سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کے جد امجد سید احمد بیغم کے والد ماجد کا نام سید براق درج کیا گیا ہے ہم کہتے ہیں یہ نام جس طرح حرف (ر) سے ضبط کیا گیا ہے یہ درست نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح تلفظ حرف (د = ڈ) سے سید بداق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ترمذی سادات کے تین قلمی شجرے میرے پیش نظر ہیں (۱) قبائلی علاقہ باجوڑ کے سید محبوب جان ترمذی کے شجرے۔ (۲) وادئ پشاور موضع محب بانڈہ کے سید عبدالخالق ترمذی مرحوم کے شجرے اور (۳) شجرہ مندرجہ کتاب اسرار طریقت موئلفہ سید شاہ محمد غوث گیلانی لاہوریؒ۔ ان تینوں شجروں میں یہ نام صحیح طور پر شاہ بداق درج کیا گیا ہے۔ علاقائی لہجوں کے اختلاف کے پیش نظر اس حرف (د) کی جگہ حرف (ل) تلفظ کرنے سے یہ (بلاق) بھی بولا جاتا ہے اور یہاں سکونت پذیر ہونے کی نسبت سے خواجہ سید بہاؤالدین نقشبندؒ کے جد امجد سید داؤد رومی کو بھی شاہ بلاق کہا گیا ہے (داؤد رومی شاہ بلاق ابن سید کمال الدین نقیب ابن سید جمال الدین امیر مرتضیٰ ابن سید محی الدین نجیب ابن سید امیر علی (رجیب) ابن سید فخر الدین عبدالرحیم ابن سید خیر الدین محمود ابن سید ابو عبداللہ علی اکبر ابن حضرت امام حسن عسکری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسی طرح حضرت پیر باباؒ کے جد امجد سید احمد بیغم کے والد ماجد بھی شاہ بداق کے نام سے یاد کئے گئے ہیں۔ حضرت شاہ محمد غوث قادریؒ کی تالیف اسرار طریقت میں یہ نام شاہ ہمدان لکھا ہے۔ یعنی بداق کی جگہ ہمدان تحریر کیا گیا ہے لیکن جاننا چاہئے کہ پیر باباؒ صاحب کے شجرہ نسب کا شاہ ہمدان اور سید امیر کبیر علی ہمدانی دو الگ الگ شخصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

جبکہ دونوں کا زمانہ ایک ہے اور اوپر جاکر سید حسین الاصغر ابن علی زین العابدین پر ان دونوں کا شجرہ مل جاتا ہے۔ مزید تفصیل آگے چل کر آتی ہے۔

پہلی بات جو مذکورہ شجرہ میں سب سے زیادہ قابل غور توجہ ہے وہ یہ نام ہیں۔ سید محمود مکی ابن سید محمد مہدیؒ ابن امام حسن عسکریؒ ہم کہتے ہیں کہ حضرت امام حسن عسکریؒ کے فرزند سید امام مہدیؒ کے کسی فرزند ہونے یا ان کی نسل باقی رہنے کا سوال ہی خارج از بحث ہے وجہ یہ کہ امام عالی مقام محمد مہدیؒ تو کتاب رحمتہ للعالمین (جلد ۲ صفحہ ۱۵۴) تالیف قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی روایت کے مطابق چار سال کی عمر میں مملکت عراق کے شہر (سامرا: سر من رائی) کی ایک پہاڑی غار میں غائب ہو گئے تھے اور سید امیر علی کی تالیف "سپرٹ آف اسلام" میں بیان کیا گیا ہے کہ سید محمد مہدی (ولادت نصف شعبان ۲۵۵ھ بمطابق یکم اگست ۸۶۹ء) پانچ سال کی عمر میں (۲۶۰ھ / ۸۷۴ء) سامرا کی پہاڑیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ واقعات کا تسلسل یہ بتلا رہا ہے کہ مورخہ ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ بمطابق ۲ جنوری ۸۷۴ء) کو حضرت امام حسن عسکریؒ کی وفات ہوئی اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد امام محمد مہدیؒ غائب ہو گئے تھے اور اسی مناسبت سے اہل تشیع آپ کے نام کے ساتھ حاضر امام اور غائب امام کے توصیفی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جب چار یا پانچ سال کی عمر میں آپ کا غائب ہونا تسلیم شدہ امر ہے تو ایسی صورت میں آپ کی نسل باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہے کہ حضرت امام حسن عسکریؒ کی نسل باقی ہے اور یہ کہ محمود مکی آپ کا پوتا بھی ہے لیکن زیر بحث یہ بات رہی ہے کہ سید محمود مکی کو سید محمد مہدی کا فرزند کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس سوال پر جب مزید تحقیق کی گئی تو معلوم ہو گیا کہ واقعات کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابو محمد امام حسن عسکریؒ نے ۲۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کے تین بیٹے باقی رہ گئے تھے (۱) قاسم (۲) علی اکبر (۳) محمد مہدی۔ پہلا فرزند تو لاولد تھا۔

تیسرے (امام محمد مہدی) چار سال کی عمر میں غائب (یا فوت) ہو گئے تھے۔ اور آپ کی نسل دوسرے فرزند سید علی اکبر سے باقی ہے اور یہ محمود مکی دراصل ان ہی ابو عبداللہ علی اکبر کے فرزند ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے (۱) عبداللہ (۲) عبدالرحیم۔

سید عبداللہ ان کے دو فرزند تھے (۱) احمد (۲) حسین

(۱) سید احمد بن سید عبداللہ بن محمود مکی وہ بزرگ ہیں جو غزنوی سادات کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کی نسل کے سادات پشین (کوئٹہ۔ بلوچستان) مستونگ، قندھار، مشکی، غزنی اور پشاور میں آباد ہیں اور اہل سنت والجماعت کے پیروکار ہیں۔ اسی خاندان میں حضرت سید ہارون و سید علی دونوں بھائی غزنی کے متصل ششن گاؤں پشاور تشریف لاکر حضرت پیر باباؒ کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر آپ کا مزید تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱۱) سید حسین بن سید عبداللہ و سید محمود مکیؒ بزرگ ہیں جن کی چھٹی پشت میں ایک نواسے کا نام سید خواجہ مودود چشتی ہراتی (متوفی ۵۲۷ھ / ۱۱۳۲ء) ہے جن کی نسل مودودی سادات اور ہروی سادات کے ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔ آپ کا شجرہ اس طرح ہے (سید مودود چشتی بن محمد سمعان بن ابراہیم بن محمد بن حسین بن عبداللہ بن محمود مکی بن ابو عبداللہ علی اکبر بن حضرت امام حسن عسکریؑ

سید عبدالرحیم ان کے فرزند کا نام سید امیر علی تھا جن کے ایک فرزند کا نام سید محی الدین تھا اور ان تک حضرت محبوب ربانی سید بہاؤالدین نقشبند بخاری "بانیٔ سلسلہ نقشبندیہ" کا شجرہ نسب پہنچتا ہے۔

شجرہ نسب پیر باباؒ کے متعلق دوسری روایت بحوالہ اسرار طریقت مؤلفہ سید شاہ محمد غوث لاہوری میں نام اس طرح ہیں (سید محمد غوث گیلانی ابن بنت سید جمال الدین ابن سید عبدالوہاب المعروف میاں عبدل بابا ابن سید مصطفیٰ ابن سید السادات علی

ترمذی المعروف پیر باباؒ ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نور بخش ابن سید احمد بیغم ابن سید شاہ ہمدان ابن سید احمد مشتاق ابن سید شاہ ابوتراب ابن سید حامد ابن سید محمد ابن سید حسام الدین ابن سید شاہ ناصر خسرو ابن سید جلال گنج علم ابن سید امیر علی ثالث ابن ابوالحسن علی ابن سید عبداللہؒ ثانی ابن سید ابوالحسن علی صالح ابن سید عبداللہ اعرج ابن سید حسین اصغر ابن سید السادات علی زین العابدین ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(بحوالہ اسرار طریقت صفحہ ۵۵ مطبوعہ لاہور اور قلمی نسخہ در ملکیت جناب سید امیر شاہ قادری گیلانی زاد شرفہ ساکن یکہ توت پشاور)

ایک نظر شجرہ مؤخرالذکر سے ظاہر ہے کہ اس میں حضرت پیر باباؒ صاحب کا شجرہ سید حسین اصغر بن حضرت امام علی زین العابدینؒ تک پہنچایا گیا ہے۔ جبکہ اخوند درویزہؒ کی روایت میں آپ کا شجرہ حضرت امام محمد باقرؒ بن حضرت امام علی زین العابدین تک پہنچایا گیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سید امیر علی تک نام دونوں شجروں میں ایک جیسے ہیں تبدیلی اس سے اوپر کے ناموں میں کی گئی ہے۔ اخوند درویزہؒ کے شجرہ میں سید امیر علی کے والد کا نام عبدالرحیم ہے اور شاہ محمد غوث صاحبؒ کے شجرہ میں ابوالحسن علی ہے اب ہم اگر یہ مان لیں کہ حضرت پیر باباؒ کا شجرہ نسب وہی ہے جو شاہ محمد غوث صاحبؒ نے درج کیا ہے تب ایسی صورت میں بھی اس شجرہ میں کچھ اشکالات والتباسات ہیں۔ اور بعض ایسی باتیں ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اور سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ محمد غوثؒ کا شجرہ اپنی موجودہ شکل میں ناقص ہے۔ اس میں حضرت پیر باباؒ کا نام بائیسویں پشت میں آجاتا ہے جبکہ علم اصول تاریخ کی رو سے ایک سو سال میں تین آدمی آجاتے ہیں۔ اس کے حساب سے پیر بابا صاحبؒ کا زمانہ تقریباً ۷۳۳ھ بن جاتا ہے جبکہ آپ ۹۹۱ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ

کے شجرہ میں آٹھ نام کم ہیں آپ کا نام شجرہ میں بتیسویں نمبر پہ آنا چاہیئے تھا. حضرت اخوندِ درویزہؒ کے شجرہ پہ نظر ڈالئے اس میں جو نام موجود ہیں وہ جناب شاہ محمد غوث صاحبؒ نے نہیں لکھے. ان کے شجرہ میں ۳۱ احامد ابن محمد ابن حسام الدین ہے جبکہ اخوند درویزہؒ کے شجرہ میں یہ نام اس ترتیب سے ہیں. حامد ابن محمود ابن اسحاق ابن عثمان ابن جعفر ابن عمر ابن محمد ابن احسام الدین اس طرح حامد اور محمد کے درمیان پانچ نام وہ ہیں جو شاہ محمد غوثؒ کے شجرہ میں لکھنے سے رہ گئے ہیں. لیکن اس طرح بھی ناموں کی تعداد ستائیس ؎۲ بنتی ہے. اب بھی تین نام کم ہیں. اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ کمی کہاں پہ اور شجرہ کے کن ناموں کے درمیان ہے.

۲۔ شاہ محمد غوث صاحبؒ کے شجرہ میں ایک دوسری بات جو قابل غور ہے اور اس کی تصحیح ضروری ہے وہ یہ کہ آپ فرماتے ہیں "علی صالح بن عبداللہ اعرجؒ" اب اتفاق یہ ہیں کہ حسین الاصغر کے پانچ فرزند ہیں. عبداللہ زاہد، عبیداللہ اعرج، علیؒ، سلیمانؒ ابو محمد الحسنؒ. اس سے ظاہر ہے کہ جو اعرج کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں وہ عبداللہ اعرج نہیں بلکہ عبیداللہ اعرج ہیں اور سید ابوالحسن علی صالح ان کے فرزند ہیں نہ کہ عبداللہ کے کیونکہ وہ اعرج نہیں بلکہ زاہد کے عرفی نام سے مشہور ہیں. ملا حسین واعظ کاشفی ہروی اپنی تالیف روضۃ الشہداء میں لکھتے ہیں کہ ابوالحسن علی صالح ایک بزرگ ہستی تھے. عراق کی حکومت و ریاست آپ کی اولاد کے ہاتھ میں تھی. آپ کی کنیت ابوالحسن ہے. آپ مستجاب الدعوات تھے اور آپ کی نسل عبیداللہ ثانی سے جاری ہے. ملاحظہ کیجئے. یہ نام بھی شاہ محمد غوث صاحبؒ عبداللہ ثانی لکھ رہے ہیں.

نیز حضرت شاہ محمد غوث صاحبؒ فرماتے ہیں "چونکہ حضرت سید عباس ابن سید جمال الدین ابن سید عبدالوہاب ابن سید مصطفیٰ ابن پیر بابا" فقیر کے ماموں تھے جو سید علی ترمذی (پیر بابا) اور سید علی ہمدانی قدس اللہ اسرارہم کی اولاد میں سے

صیحح النسب سید تھے اور پورے متقی و پرہیز گار تھے"۔ گویا شاہ محمد غوث صاحب نے مندرجہ بالا سطور میں سید علی ترمذی" کو سید امیر کبیر علی ہمدانی کی نسل سے بیان کیا ہے جو ایک جلیل القدر اور مشہور بزرگ ہو گزرے ہیں۔ سرزمین کشمیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں آپ کا نام زندہ جاوید ہے۔ آپ کے سلسلہ نسب کے متعدد شجرے ہمارے پاس موجود ہیں۔ اگر بقول شاہ محمد غوث صاحبؒ پیر بابا صاحب" کا شجرہ نسب سید امیر کبیر علی ہمدانی" تک پہنچتا ہے تو ہمیں ان کے مختلف شجروں پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہو گی تاکہ جہاں جہاں ناموں میں فرق ہو ان کی وضاحت کی جا سکے۔ اس سلسلہ میں سید علی ہمدانی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دوسرے خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب کا ایک تقابلی مطالعہ کرنا ہو گا۔

(ا) حضرت شاہ محمد غوث صاحبؒ نے سید علی (پیر بابا") ابن سید قنبر علی ابن سید احمد نور ابن سید یوسف نور ابن سید محمد نوربخش ابن سید احمد بیغم ابن شاہ ہمدان لکھا ہے۔

(ب) اخوند درویزہ باباؒ نے سید احمد بیغم ابن سید براق لکھا ہے۔ یعنی شاہ ہمدان کی بجائے شاہ براق لکھا ہے۔

(ج) اس کے بعد شاہ محمد غوث صاحبؒ نے عبید اللہ ثانی کے فرزند کا نام ابوالحسن علی لکھا ہے۔ جبکہ روضۃ الشہدار میں یہ نام صرف علی ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ابوالحسن تو آپ کے جد امجد ہیں۔ جن کی علی صالح کنیت ہے۔

(د) اس کے بعد شاہ محمد غوث صاحبؒ نے اس علی (ابوالحسن) کے فرزند کا نام امیر علی ثالث لکھا ہے۔ حالانکہ روضۃ الشہدار میں یہ نام عبید اللہ ثالث ہے۔

(ح) اسکے؟ شاہ محمد غوث صاحبؒ نے امیر علی ثالث (جو صیحح نام عبید اللہ ثالث ہے) کے فرزند کا نام سید جلال گنج لکھا ہے۔

حالانکہ صحیح شجرہ اس طرح ہے یا ہونا چاہیئے۔ سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی ابن ابو علی محمد امیر حاج ابن امیر ابوالحسن علی صالح ابن ابو علی عبید اللہ اعرج ابن سید حسین الاصغر ابن سید امام علی زین العابدین سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یعنی شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ کی رو سے سید جلال الدین جعفر گنج عالم جو نویں پشت میں آرہے ہیں۔ روضتہ الشہداء کے اس شجرہ کی رو سے بارہویں پشت میں آجاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے جو تین ناموں کی کمی بتائی گئی تھی اس حساب سے وہ کمی پوری ہو جائے گی اور حضرت پیر باباؒ کا نام اس شجرہ کی رُو سے تیسویں پشت میں آجائے گا۔

نوٹ مندرجہ بالا امیر ابوالحسن محمد اشتر کے متعلق روضتہ الشہداء کا بیان ہے کہ آپ کے بیس فرزند تھے اور یہ کہ آپ مشہور شاعر ابی الطیب کے ممدوح تھے۔ دوسری بات یہ کہ سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد سید امیر علی کے ایک بھائی کا نام سید ابوالعلی مسلم احول امیر حاج المعروف کبش عبداللہ تھے اور ان کے فرزند عمر مختار امیر حاج۔ سادات بنی مختار آپ کی نسل سے ہیں۔ اسی خاندان کے سادات علاقہ تیراہ اور کنڑ ئ میں موجود ہیں۔ تیسری بات یہ کہ امیر ابوالحسن محمد اشتر کی نسل اشتری سادات کہلاتی ہے جن میں ابو یعلی نقیب واسط ابوالمعالی اور ابوالفضائل۔ بنو عرام۔ بنو عجیبہ، بنو صائم، بنو معلاج۔ بنو ابی الغنام، ابو احمید، بنو طبیق۔ نقبائے عراق اور امرائے حاج کے خاندان قابل ذکر ہیں۔

۳۔ شاہ محمد غوث صاحبؒ کی تیسری بات جو قابل غور ہے وہ فرماتے ہیں" چونکہ سید عباس فقیر کے ماموں تھے جو حضرت سید علی ترمذی (پیر باباؒ) اور سید علی ہمدانی قدس اسرارہم کی اولاد میں صحیح النسب سید تھے اور پورے متقی و پرہیز گار تھے"۔ شاہ محمد غوث صاحب نے شجرہ میں تو اجمالاً شاہ ہمدان لکھا ہے اور یہاں تصریح کر دی کہ شاہ ہمدان سے مراد سید علی ہمدانی ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ہماری الجھنوں میں اضافہ کر دیتی ہے اور ہمیں

اس پر بحث و نظر کی ضرورت ہے۔

(الف) ایک تو وہ شجرہ ہے جو شاہ محمد غوث صاحبؒ کی روایت کے مطابق سید علی ترمذی (پیر باباؒ) سے تعلق رکھتا ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

(ب) دوسرا شجرہ کرم ایجنسی کے سادات کڑمان اور شلوزان کا ہے جس میں ان کے جدامجد سید ابو الحسن فخر عالم کا سلسلہ حضرت سید حسین الاصغر تک پہنچایا گیا ہے جو اس طرح ہے: (سید ابوالحسن محمود ولد سید ابو القاسم جعفر ولد سید قاسم الملقب بہ یحییٰ (مزار در ہرات) ولد سید حسن (مدفن در بخش) ولد سید جعفر ولد سید حسین ولد سید جعفر عبید اللہ اعرج (مدفن کوفہ) ولد سید حسین اصغر ولد سید امام علی زین العابدین ولد سید الشہداء حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

(ج) تیسرا شجرہ حضرت سید امیر کبیر علی ہمدانی بروایت خزینۃ الاصفیاء اس طرح ہے امیر کبیر سید علی ہمدانی ابن شہاب الدین ابن محمد ابن علی ابن یوسف ابن شاہ شریف ابن محب اللہ محمد ثانی ابن جعفر ابن عبداللہ ابن حسن ابن حسین ابن عبداللہ زاہد ابن حسین اصغر ابن امام علی زین العابدین ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم ص۱

ص۱ سید امیر کبیر علی ہمدانی کے والد کا نام سید شہاب الدین ہے جبکہ بمطابق شجرہ پیر باباؒ (در تذکرۃ الابرار والاشرار) سید احمد شاہ بداق کے والد کا نام سید احمد مشتاق ہے۔ سید علی ہمدانی (بمطابق کتاب حضرت امیر علی ہمدانی مؤلفہ ڈاکٹر محمد ریاض صفحہ ۴۴ - ۴۶) شاہ ہمدانی کی ایک بیٹی تھی جو جناب ابواسحاق ختلانی کے عقد میں تھی جو شاہ ہمدان کے (داماد) اور خلیفہ مجاز و جانشین تھے۔ آپ کے اکلوتے بیٹے کا نام سید میر محمد ہمدانی تھا۔ جبکہ روایت اخوند درویزہ" کے مطابق شاہ بداق کے فرزند کا نام سید احمد بیغم ہے۔ لہٰذا سید امیر کبیر علی ہمدانی" کے ساتھ حضرت پیر باباؒ کا نسبی تعلق نہیں ثابت ہوتا البتہ آپ کے جدامجد سید محمد نوربخشؒ کو طریقہ کبرویہ میں سید علی ہمدانی سے نسبت ہے۔ سید محمدؒ نوربخش

(۴) چوتھا شجرہ سید امیر کبیر علی ہمدانی کی والدہ ماجدہ کا ہے جو یہ ہے سید علی ہمدانی ابن بنت (نامعلوم) ابن سیدہ زہرا بنت سید قاسم ابن جمال الدین محمد ابن حسن ابن ابی زید ابن علی کیا کی ابن عبداللہ ابن علی ابن ابراہیم ابن اسماعیل المنقدی ابن جعفر ابن عبداللہ (زاہد) ابن حسین اصغر ابن امام علی زین العابدین ابن امام حسین علیہ السلام۔

اہم نکتے۔ جب ہم ان چاروں شجروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں چند نکات ایسے سامنے آتے ہیں جو بحث طلب ہیں۔

نکتہ اوّل۔ ان شجروں میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید حسین الاصغر کے نام دو طرح ضبط کئے گئے ہیں۔ اسرار طریقت میں لکھا ہے۔ عبداللہ اعرج ابن سید حسین اصغر، دوسری طرف خزینۃ الاصفیا میں ہے۔ سید ابو جعفر عبداللہ اعرج ابن سید حسین اصغر، تیسرے خزینۃ الاصفیا اور فصول الفخریہ میں علی الترتیب عبداللہ زاہد اور عبداللہ بن حسین اصغر لکھا ہے۔ اسرار طریقت کے مطابق سید علی ہمدانی کا سلسلہ نسب عبداللہ اعرج اور خزینۃ الاصفیاء کی روایت سے سید علی ہمدانی کا سلسلہ نسب عبداللہ زاہد تک پہنچتا ہے۔ یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سید علی ہمدانی کے جد امجد اور سید حسین اصغر کے فرزند کا نام سید عبداللہ ہے یا سید عبیداللہ؟ خزینۃ الاصفیا کا عبداللہ زاہد اور اسرار طریقت کا عبداللہ اعراج ظاہر ہے دو الگ الگ نام ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ التباس کی وجہ کیا ہے جس کے لئے ہمیں سید حسین الاصغر کے فرزندوں کے شجروں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

نکتہ دوم۔ دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ کتاب اسرار طریقت، خزینۃ الاصفیا اور شجرہ سادات کرمان کے مندرجہ ناموں میں بھی کمی بیشی ہے اور ناموں کی ترتیب میں بھی

خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت سید ابو اسحاق ختلانیؒ کے جو جانشین تھے امیر کبیر علی ہمدانیؒ کے سید محمد نور بخش نے بعد میں سلسلہ نور بخشیہ کی بنیاد بھی ڈال تھی۔

فرق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ شجرے نقل کئے ہیں ہر ایک سے درمیان میں جگہ جگہ سے کچھ نام چھوڑ دیئے ہیں یا ان کی ترتیب میں تبدیلی پیدا کی ہے یا بعض نام صحیح طور پر نہیں لکھے گئے ہیں اور بعض شجروں میں ناموں کی بجائے صرف اسمائے کنیت درج کئے گئے ہیں۔ مختلف شجروں کے تقابلی مطالعہ سے اس قسم کے فرق اور کمی بیشی پر روشنی پڑ سکتی ہے اور ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ حالت میں ہر شجرہ میں پورے نام درج نہیں ہیں اور اس طرح یہ تینوں شجرے اپنی اپنی جگہ غیر مکمل اور ناقص ہیں لہذا ہم چاہتے ہیں کہ تقابلی مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ تینوں شجرے مکمل ہو جائیں اور ان کی تصحیح کی جاسکے۔

حسین الاصغر اور انکے فرزندان - کتاب رحمۃ للعالمین مؤلفہ قاضی محمد سلیمان

سلمان منصور پوری میں حضرت حسین الاصغر ابن حضرت امام علی زین العابدینؑ کے فرزندوں کے نام یہ ہیں (۱) عبداللہ زاہد (۲) عبیداللہ اعرج (۳) علی (۴) ابو محمد الحسن (۵) سلیمان ان سب کی نسل باقی ہے، حجاز، شام، عراق اور مغرب (الجزائر، مراکش، تیونس) میں ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہم کہتے ہیں اس نسل کے سادات ایران، خراسان طخارستان، برصغیر پاک و ہند اور افغانستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس بیان سے واضح ہے کہ سید حسین اصغر کے فرزندوں میں بڑے کا نام عبداللہ اور زاہد اس کا توصیفی لقب ہے۔ اسی طرح اعرج کے توصیفی لقب سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے دوسرے فرزند عبیداللہ یاد کئے جاتے ہیں۔ اس وضاحت کے پیش نظر جہاں اسرار طریقت میں اور شجرہ سادات کٹرمان میں اعرج کے لقب سے عبداللہ کو یاد کیا گیا ہے اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نام کا توصیفی لقب ٹھیک ہے تب یہ نام عبداللہ نہیں بلکہ عبیداللہ پڑھنا چاہیئے اور اگر یہ صحیح نام عبداللہ ہے تو اس کے ساتھ اعرج نہیں بلکہ زاہد پڑھنا چاہیئے۔ جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء کی

روایت میں درج ہے اس وضاحت کی رو سے سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے جدامجد
سید حسین الاصغر کے سب سے بڑے فرزند عبداللہ زاہد کو سمجھنا چاہیئے وجہ یہ ہے
کہ ان دونوں شجروں میں حسین اصغر کے ایک دوسرے پوتے کا نام عبداللہ اور عبداللہ
ثانی درج ہے نہ کہ عبیداللہ ثانی۔ اس سے یہ مراد لیا جائے گا کہ اس شجرہ کے سادات
عبیداللہ اعرج کی نسل سے نہیں بلکہ عبداللہ زاہد کی نسل سے ہیں اور اس طرح اسرار
طریقت وغیرہ میں تصحیح کر کے عبیداللہ اعرج کی بجائے عبداللہ زاہد لکھا جائے گا۔

نکتہ سوم تیسرا قابل غور نکتہ عبداللہ زاہد کے فرزند کے نام میں اختلاف
کا ہے۔ خزینۃ الاصفیار میں ہے۔ حسن ابن حسین ابن جعفر ابن حجر ابن عبداللہ
زاہد اور شجرہ سادات کٹرمان میں ہے۔ حسن ابن جعفر ابن حسین ابن ابوجعفر عبداللہ
ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خزینۃ الاصفیار کے شجرہ میں ایک نام 'حجر' کا اضافہ التباس پر مبنی
ہے واقعات یہ ہیں کہ جعفر بن عبداللہ زاہد مدینہ منورہ کے قریب مقام حجر میں سکونت
پذیر تھے اور جعفر حجری کے نام سے یاد کئے جاتے تھے بعد میں حجر کے مقام کو غلطی سے
والد کا نام سمجھا گیا (یہ نام 'حجر' قرآن پاک میں بھی مذکور ہے۔ "وَكَذَّبَ أَصْحَابُ
الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ")اس وضاحت کے پیش نظر عبداللہ زاہد کے فرزند کا نام جعفر قرار
پاتا ہے اور اس بناء پر شجرہ سادات کٹرمان میں عبداللہ زاہد کا اسم کنیت ابو
جعفر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری بات اس شجرہ میں ناموں کی ترتیب ہے یہ نام حسین ابن
جعفر ابن حسین ابن عبداللہ زاہد کی بجائے اس ترتیب سے ہونے چاہئیں۔ حسن
ابن حسین ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد۔ کتاب فصول الفخریہ میں بھی عبداللہ کے
فرزند کا نام جعفر ہے اور درمیان میں حجر کا اضافہ صحیح نہیں ہے۔

نکتہ چہارم۔ سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ عبداللہ زاہد کے فرزندوں میں
ایک پوتے کا نام عبداللہ ثانی ہے اس (عبداللہ ثانی) اور عبداللہ زاہد (اوّل) کے

درمیان مختلف شجروں میں جو نام دیئے گئے ہیں، ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔

(ا) کتاب اسرار طریقت کے شجرہ میں ایک ہی نام علی صالح درج ہے (عبداللہ ثانی ابن علی الصالح ابن عبداللہ زاہد (اول)

(ب) شجرہ سادات کٹرمان میں سید عبداللہ ثانی اور عبیداللہ اعرج کے ناموں کے درمیان چار نام ہیں۔ عبداللہ ثانی ابن قاسم ابن حسن ابن جعفر ابن حسین ابن عبیداللہ اعرج۔

(ج) خزینۃ الاصفیاء میں یہ نام اس طرح ہیں۔ عبداللہ ثانی ابن محمد ابن حسن ابن حسین ابن جعفر ابن حجر ابن عبداللہ زاہد۔

ان تینوں شجروں کے ناموں میں اس طرح تطبیق کی جاسکتی ہے کہ:

(۱) شجرہ اسرار طریقت کی روایت درست تسلیم کی جائے کہ عبداللہ ثانی کے والد کا نام علی الصالح ہوگا لیکن علی الصالح براہ راست عبداللہ زاہد کا فرزند نہیں بلکہ ان دونوں ناموں کے درمیان شجرہ سادات کٹرمان کے ناموں کا اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح سے عبداللہ ثانی ابن علی الصالح ابن قاسم ملقب بہ یحیٰی ابن حسن ابن حسین ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد ہوگا۔

(۲) باقی رہ جاتی ہے یہ بات کہ سادات کٹرمان کے مندرجہ بالا شجرہ میں حسن بن حسین کے فرزند کا نام لکھا گیا ہے ابوالقاسم الملقب بہ یحیٰی اور خزینۃ الاصفیاء میں محمد لکھا گیا ہے۔ اس میں تطبیق پیدا کرنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نام کو اس طرح لکھا جائے۔ ابوالقاسم محمد (یحیٰی) دوسری صورت یہ ہے کہ ان دونوں ناموں کو ابوالقاسم یحیٰی پڑھا جائے اور درمیان میں ایک نام محمد کا اضافہ کیا جائے اس طرح سے نسب لقا ثانی ابن ابوالقاسم یحیٰی ابن محمد ابن حسن ابن حسین ابن جعفر ابن عبداللہ زاہد ابن حضرت امام علی زین العابدین سید الشہدا امام

حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ o

نکتۂ پنجم۔ سادات کٹرمان اور خزینۃ الاصفیاء دونوں کے شجرہ میں عبداللہ ثانی کے فرزند کا نام جعفر ہے لیکن اسرار طریقت میں عبداللہ ثانی اور جلال الدین جعفر گنج عالم شہید کے درمیان دو ناموں کا اضافہ اس طرح موجود ہے سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی ثالث ابن سید ابوالحسن علی ابن سید عبداللہ ثانی۔ ہم کہتے ہیں کہ کتاب اسرار طریقت کا یہ بیان کہ سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد ماجد کا نام سید امیر علی ثالث اس لئے صحیح ہے کہ مولانا الشیخ غوث الخلائق اخوند درویزہ کی تالیف تذکرۃ الابرار والاشرار میں بھی سید جلال الدین جعفر گنج عالم کے والد کا نام سید امیر علی درج ہے۔ البتہ اسرار طریقت میں ان کے ساتھ لفظ 'ثالث' کی جو تصریح موجود ہے وہ اس لحاظ سے درست ہے کہ جب ہم اس شجرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سید عبداللہ زاہد کی نسل میں سید جعفر کے والد (سید امیر علی ابن ابوالحسن علیؒ ابن عبداللہ ثانی علیؒ الصالح) واقعی تیسرے نمبر کے علی ہیں۔

نکتۂ ششم۔ اخوند درویزہ باباؒ اور سید شاہ محمد غوث صاحبؒ دونوں میں سید جلال الدین جعفر گنج عالم ابن سید امیر علی کا لقبی نام گنج علم درج ہے اور انہی کے فرزند کا نام سید شاہ ناصر خسرو ہے۔ خزینۃ الاصفیاء و سادات کٹرمان کے شجرہ میں سید امیر علی کے فرزند کا نام علی الترتیب جعفر اور ابوالقاسم جعفر درج ہے اور شجرہ سادات کٹرمان میں انہی سید ابوالقاسم جعفر کے فرزند کا نام ابوالحسن فخر عالم ہے جن کا پورا نام اس طرح ہے "ابوالحسن محمد ثانی فخر عالم محب اللہ" اب اگر یہ سمجھا جائے کہ سید جلال الدین جعفر گنج علم ابوالقاسم جعفر اور سید جعفر تینوں ایک ہی شخص کے نام ہیں جو مختلف تین طریقوں سے ضبط کئے گئے ہیں تب یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس جعفر کے تین فرزند تھے (۱) سید شاہ ناصر خسرو شہید (۴۰۹ھ ۱۰۱۸ء)

جو سید علی ہمدانیؒ اور پیر باباؒ کے جد امجد ہیں (۲) سید ابوالحسن محمد ثانی فخر عالم محب اللہ جو سادات کرمان وغیرہ کے جد امجد ہیں۔ اور جن کا تفصیلی تذکرہ ہم نے اپنی تالیف تاریخ کرم میں درج کر دیا ہے (۳) تیسرے فرزند کا نام والد کی کنیت کی رو سے قاسم ہوگا۔ ان کا تذکرہ ہمیں مذکورہ بالا شجروں میں نہیں ملتا البتہ سید محمود پیر بابا کی ساکن گندف (علاقہ گدرن) ۱۲۷۶ھ نے اپنی تالیف تذکرہ السادات (قلمی نسخہ) میں ایک سید جلال گنج العلم بغدادی کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سید جلال گنج علم کے جس فرزند کا نام قاسم تھا اس کا لقبی نام عطاء اللہ تھا۔ سید محمود گدرنی کے فارسی بیان کا ترجمہ یہ ہے "سید جلال گنج العلم بغدادی جو محمد حسین بغدادی کے فرزند تھے۔ مشہد میں قیام پذیر تھے۔ بتیس سال بعد وہاں سے بھکر آئے اور پھر بھکر سے کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کی غرض سے ملک کاشکار اور دیر تشریف لے گئے۔ وہاں جہاد کی لڑائیاں لڑتے رہے اور وہیں سرزمین دیر میں سکونت اختیار کی۔ آپ کا نام سید جلال گنج علم ہے اور آپ کا سلسلہ نسب سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید ابو عبداللہ علی اکبر ابن سید امام حسن عسکریؒ کے ذریعے حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔

اس سے پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کے عام شجروں میں جہاں ایک نام شاہ بداق ذکر کیا گیا ہے وہاں اسرار طریقت میں اسی نام کی جگہ شاہ ہمدان درج ہے جس سے مراد سید امیر کبیر علی ہمدانی ہیں۔ شاہ بداق (بلاق) آپ کا جغرافیائی نسبتی نام ہے جس طرح ہمدان کے رہنے والے شاہ ہمدان کہلائے اور آپ کا اسم گرامی علی تھا۔ لیکن یہاں ایک تاریخی نسبت کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی عہد میں جس میں سید امیر کبیر علی ہمدانی (شاہ بداق بن سید احمد مشتاق) زندگی گزار رہے تھے ایک دوسرے سید علی ہمدانی بھی بقید حیات تھے جن کا مسلک شیعہ اثنا عشریہ تھا اور سید علی سیاہ پوش کے نام سے مشہور تھے اس سید علی ہمدانی کا شجرہ نسب سید

ابوالحسن محمد ثانی فخر عالم کے واسطہ سے سید حسین الاصغر ابن امام علی زین العابدینؑ تک پہنچتاہے۔ ان دونوں ہم عصر حضرات میں فرق کرنا ضروری ہے۔

نتیجہ: مندرجہ بالا وضاحتوں سے یہ نتیجہ لیا جاسکتاہے کہ:

(۱) کتاب تذکرۃ الابرار والاشرار کے مندرجہ شجرہ میں سید جلال گنج علم کو سید امیر علی ابن سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن علی اکبر ابن امام حسن عسکری کہا گیا ہے

(۲) اسرار طریقت میں انہی سید جلال الدین جعفر گنج علم کو ابن سید امیر علی ثالث ابن سید ابوالحسن علی کہا گیا ہے۔

ان دونوں شجروں میں التباس سید علی کے نام نے پیدا کیا ہے اور اس التباس کی وجہ سے سید امیر علی بن عبدالرحیم کی جگہ امیر علی بن ابوالحسن مراد لے کر شجرہ بجائے امام محمد باقرؑ ابن امام علی زین العابدینؑ کے سید حسین الاصغر ابن امام علی زین العابدینؑ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت شاہ محمد غوث صاحبؒ نے امیر علی کے ساتھ لفظ ثالث (تیسرا) بڑھا کر اس التباس کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر شاہ محمد غوث صاحبؒ کے شجرہ کو درست تسلیم کر لیا جائے اور سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کو سید حسین الاصغر کی نسل کے سادات میں شمار کیا جائے تو اسے ایک نیا انکشاف سمجھا جائے گا جو کم از کم حضرت پیر بابا صاحبؒ کی نسل کے سادات کے علم میں نہیں ہے۔

(۷) یہاں تاریخی فائدہ کے لئے ایک وضاحت ضروری ہے کہ حضرت پیر باباؒ کے اسم گرامی کے ساتھ جغرافیائی نسبتی نام ترمذی بھی لکھا جاتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ ترمذ نام کے دو علاقے ہیں ایک روسی ترکستان کے علاقہ ماوراءالنہر میں ہے جس کا قدیمی نام صغد یانا (سوگدیانا) اور پری دیش بھی ہے۔ دوسرا ترمذ افغانی ترکستان میں ہے جس کا قدیمی نام طخارستان اور سری دیش بھی ہے۔ آسانی کے لئے ہم صغدیانا کو بخارا اور طخارستان کو بلخ کہہ سکتے ہیں۔ بخارا و بلخ دونوں ملکوں میں ترمذ نام کے جو

علاقے ہیں۔ یہاں سادات کے مختلف خاندان آباد رہے ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت امام علی زین العابدین کے تین فرزندوں امام محمد باقرؑ، سید علی الاصغر اور سید حسین الاصغر کی نسلوں کے سادات کا ذکر نا مناسب ہے۔

(۱) حضرت امام محمد باقرؑ کے فرزند امام جعفر صادقؑ تھے۔ جن کے فرزندوں میں امام اسمٰعیل، امام موسیٰ کاظم اور امام عبداللہ الباہر کی نسل یہاں آباد رہی ہے ان میں سے امام علی رضا (ابن امام موسیٰ کاظم) کی نسل کے سادات یہاں پھیل گئے ہیں اور سید امیر علی (ابن سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن علی اکبر ابن امام حسن عسکری) کو اسی نسبت سے بخاری کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ان کے فرزند سید جلال گنج علم کو بھی بخاری کہا جاتا ہے۔

(۲) سید علی الاصغر ابن امام علی زین العابدین کی نسل بھی بخارا د بلخ میں موجود ہے اور پھر خصوصیت کے ساتھ ترمذ میں آباد رہی ہے۔ جس طرح پیر باباؒ کا نام سید علی ترمذی ہے۔ اسی طرح سید علی الاصغر کی اولاد سے بھی ایک سید علی ترمذی ہیں۔ جو تاریخی اعتبار سے پیر باباؒ سے پہلے ہو گزرے ہیں جن کا شجرہ یہ ہے۔ سید احمد توختہ ترمذیؒ ابن سید علی ترمذی ابن حسین ثانی ابن محمد مدنی ابن سید شاہ ناصر مدنی ابن سید موسیٰ ابن سید علی الحوری ابن حسین افطس ابن امام علی الاصغر ابن امام زین العابدینؑ

(۳) امام زین العابدین کے تیسرے فرزند حسین الاصغر کی نسل میں سے رہبر رایت اسرار طریقت) سید علی ترمذیؒ (پیر بابا) کا تیسرا خاندان ہے لیکن ان کا تعلق اس ترمذ سے ہے جو ولایت بلخ میں ہے یا موجودہ شمالی افغانستان میں واقع ہے یہ ترمذ موجودہ ولایت مزار و میمنہ کے شمال مشرق میں تین ذیلی دروں سے عبارت ہے۔ ایک درہ کا نام قندز (کندوز) ہے اس اعتبار سے پیر باباؒ کو سید علی قندوزی بھی کہا جاتا ہے، آپ کے والد ماجد (سید قنبر علی) اسی وادی قندز کے موضع خواجہ غلطان میں

سکونت پذیر تھے۔

(۹) جاننا چاہیئے کہ سید علی ترمذی (پیر بابا) کی پانچویں پشت میں جدامجد سید احمد مقیم ولایت بخارا کے اس ترمذ میں تشریف لائے تھے اوران کے والد سید علی شاہ ہمدان (یا سید احمد شاہ بداق) مملکت خراسان کی ولایت ہمدان میں سکونت پذیر تھے اور بعد میں سید محمد نور بخش ترمذی دوبارہ وہاں ہمدان تشریف لے گئے تھے (اور سید امیر کبیر علی ہمدانی کے خلیفہ مجاز و سجادہ نشین سید ابو اسحاق ختلانی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوکر سلسلۂ کبرویہ میں ماذون ہوئے۔ اس سلسلہ کو ذہبیہ بھی کہتے تھے) جہاں آپ نے سلسلہ نور بخشیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس اعتبار سے پیر بابا کے آباؤ اجداد نے خراسان میں زیادہ قیام فرمایا تھا۔ اسی نسبت سے آپ کا ایک لقبی نام شہنشاہ خراسان بھی مشہور ہے۔

(۱۰) حضرت اخوند درویزہ کے بیان کردہ شجرہ میں حضرت پیر بابا کی دسویں پشت میں جدامجد کا نام سید محمود ذکر کیا گیا ہے لیکن شاہ محمد غوث صاحب کے شجرہ میں سید حامد کو براہ راست سید محمد کا فرزند لکھ کر ان دونوں ناموں کے درمیان سلسلہ نسب کے پانچ نام چھوڑ دیئے ہیں۔ تذکرہ کی روایت کے مطابق پیر بابا کا نام سید حسام الدین (بن سید ناصر خسرو بن سید جلال گنج علم) سے سترہویں پشت میں آجاتا ہے جو تاریخی اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سید جلال گنج علم کو انیسویں پشت میں تسلیم کرنے اور ایک سو سال کے لئے علم اصول تاریخ کی رو سے تین آدمیوں کا سلسلہ نسب میں آنے کے حساب سے حضرت جلال گنج علم کا زمانہ ۳۵۸ھ اور پیر بابا کا ۹۹۱ھ ہے جو ۶۲۳ سال پیر بابا سے پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا انیس پشتوں کا ہونا صحیح ہے اگر اسرار طریقت کی روایت کو صحیح مانیں جس میں سید جلال گنج علم تیرہویں پشت میں آتے ہیں تو اس صورت میں ان کا زمانہ ۵۹۵ھ کے لگ بھگ بن جاتا ہے پھر اس سے اوپر اٹھارہ ناموں کی ضرورت ہوگی جو کسی شجرہ میں اتنی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔

لہذا مجبوراً ہمیں یہی سمجھنا چاہیئے کہ جو نام تذکرہ میں ہیں وہ اسرار طریقت میں لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ لیکن اس صورت میں کہ ہم حضرت پیر بابا کا شجرہ سید جلال گنج علم تک درست وہی تسلیم کریں جو تذکرۃ الابرار والاشرار میں ہے اور اس سے اوپر تذکرہ کا صحیح تسلیم کریں یا اسرار طریقت کا، ان دونوں میں فرق نہیں دونوں میں حضرت سید جلال گنج علم حضرت امام حسین علیہ السلام سے چودھویں پشت میں آجاتے ہیں۔

تحقیقی شجرہ:۔ اب ہم مندرجہ بالا وضاحتوں اور تحقیقی بحث کی روشنی میں اعلیٰ حضرت مولانا و سیدنا و مرشدنا شیخ الاسلام والمسلمین شہنشاہ خراسان غوث زماں سید علی غواص ترمذی (پیر بابا) علیہ الرحمتہ کا شجرہ نسب سید جلال گنج علم بخاری تک تذکرۃ الابرار کی روایت کے مطابق اور اس سے اوپر تذکرہ و اسرار طریقت دونوں کی روایت کےمطابق درج کر رہے ہیں۔

سید علی ترمذیؒ ابن سید قنبر علیؒ ابن سید احمد نورؒ ابن سید یوسف نورؒ ابن سید محمد نورؒ بخش ترمذی ابن سید احمدؒ بنیم ابن سید احمد (علیؒ) شاہ بداق ابن سید احمد مشتاق ابن سید حامدؒ ابن سید ایوبؒ ابو تراب ابن سید محمودؒ ابن سید اسحاقؒ ابن سید عثمانؒ ابن سید جعفرؒ ابن سید عمرؒ ابن سید محمدؒ ابن سید حسام الدین ابن سید شاہ ناصر خسرو ابن سید جلال گنج علم بخاری رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ابن سید ابوزید امیر علی

(۱) مطابق تذکرۃ الابرار:۔ ابن سید عبدالرحیمؒ ابن سید محمود مکیؒ ابن سید (ابو عبداللہ) علی اکبرؒ ابن حضرت امام حسن عسکریؒ ابن حضرت امام علی نقیؒ ابن حضرت امام محمد تقیؒ ابن حضرت امام علی رضاؒ ابن حضرت امام موسیٰ کاظمؒ ابن حضرت امام جعفر صادقؒ ابن حضرت امام محمد باقرؒ ابن حضرت امام علی زین العابدینؒ حضرت الشہداء امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

(۲) بمطابق اسرار طریقت:۔ سید جلال گنج بخاری ابن سید امیر علی (ثالث) ابن سید

ابوالحسن علی ابن سید عبداللہ ثانی ابن سید علی الصالح ابن سید ابوالقاسم محمد ابن حسن ابن حسین ابن جعفر ابن حسین (حجری) ابن سید عبداللہ زاہد ابن سید حسین الاصغر ابن امام علی زین العابدینؓ ابن سید الشہداء حضرت امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ دونوں شجرے ہمارے سامنے ہیں۔ اب ان میں کس کو صحیح قرار دیا جائے اس کا دارومدار مزید ایسی دستاویزی شہادتوں کے ملنے پر ہے۔ جس کی وجہ سے کسی ایک کو مزید تقویت حاصل ہو سکے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالْ؛

نوٹ: (قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کا تبصرہ جو ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

"عبرۃ لاولی الابصار" مؤلفہ سید عبدالجبار شاہ ترمذی ستھانوی (قلمی نسخہ) کی روایت

اخوند درویزہ باباؒ نے تذکرہ میں جو شجرہ دیا ہے اس میں سب سے بڑا اشکال سید محمود مکی کو سید امام محمد مہدی (ابن امام حسن عسکریؑ) کا فرزند بتلانا ہے۔ یہ ایک فاش غلطی تھی جس کی تصحیح و تحقیق کے لئے سید عبدالجبار شاہ صاحب نے بڑی چھان بین کی۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کے علاوہ افغانستان میں بھی جاکر معلومات فراہم کرکے اس غلطی اور دوسرے ناموں کی تصحیح میں بڑی جدوجہد کی جس کی تفصیل کتاب مذکور میں موجود ہے انہوں نے سید براق کے نام کی بھی درستی کرکے اسے سید احمد براق لکھا ہے (جبکہ قاضی عبدالحلیم اثر افغانی صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ نام علی شاہ براق یا دشاہ ہمدان ہونا چاہیئے) سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی تک تمام ناموں کی تصدیق کر لی۔ اور پہلے انہیں محض نبیرہ امام علی نقی دکھلایا لیکن مزید معلومات پر انہیں ابن جعفر خلیل اللہ ابن امام علی نقی درج کر دیا۔ غالباً جن شجروں وکتابوں کے حوالہ جات قاضی عبدالحلیم اثر صاحب نے دیئے ہیں۔ وہ سید عبدالجبار شاہ صاحب کی نظر سے نہیں گزرے کیونکہ ان کا حوالہ ان کی کتاب میں نہیں ملتا لہٰذا وہ بھی حضرت امام حسن عسکریؑ کی نسل باقی رہنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔

واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ سادات بنو فاطمہ کو خلفائے بنو امیہ و بنو عباس سے ان کی زیادتیوں کے پیش نظر ہر وقت جان کا خطرہ رہتا تھا۔ لہٰذا غالباً حضرت امام حسن عسکریؑ نے اپنے بیٹوں کو دور ممالک میں تحصیل علم اور بعد میں تبلیغ دین کے لئے بھیج دیا تاکہ مخالفین کی زد سے بچے رہیں۔ اس وجہ سے اکثر لوگوں کو ان کا علم نہ تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت امام حسن عسکریؑ نے وفات پائی تو ان کی امامت و وراثت کا دعویٰ سید جعفر (ابن امام علی نقی و برادر امام حسن عسکریؑ) نے کیا حالانکہ ان کی اولاد موجود تھی اس بناء پر اہل تشیع نے انہیں کذاب کہا ہے (جبکہ ان کی اولاد انہیں تواب، ثانی و خلیل اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں) وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ۝

قاضی سلیمان سلمان منصور پوری نے اپنی تالیف رحمۃ للعالمین کی روایت کے مطابق اور دیگر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ سید جعفر (ثانی۔ تواب) ابن امام علی نقی تھے جنہیں ابو کرین کہتے تھے کیونکہ وہ ایک سو بیس بچوں کے والد تھے ان کی وفات ۲۷۱ھ میں ہوئی ان کی نسل صرف چھ فرزندوں سے جاری ہے۔

۱۔ اسمٰعیل حریف ۲۔ یحییٰ الصوفی ۳۔ ہارون ۴۔ علی المختار ۵۔ ادریس ۶۔ طاہر۔ اس سے ظاہر ہے کہ سید جعفر ثانی (تواب) کا کوئی فرزند محمود مکی نہیں جس کی نسل باقی ہو۔ لہٰذا جب تک کسی مستند روایت سے یہ بات ثابت نہ ہو جو مذکورہ بالا روایات سے قوی ہو۔ تب تک اسے درست نہیں سمجھا جا سکتا۔

اس کے علاوہ اس نسل کے بعض افراد کے پاس ایسا شجرہ بھی ہے جس میں سید جلال گنج علم بخاری شہید (ابن سید امیر علی) متوفی ۸۰۰ھ مدفن در تالاش) کو اشتباہ نام سے سید جلال الدین حیدر سرخ بخاری (بن علی اوچی متوفی ۶۹۵ھ) سمجھ کر اس سے اوپر شجرہ سید جعفر (ثانی۔ تواب) ابن امام علی نقی سے ملا دیا ہے جو بخاری سادات کے جد امجد ہیں نہ کہ ترمذی سادات کے۔ لہٰذا یہ شجرہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔

نیز ایک اور شجرہ بھی قابلِ توجہ ہے جو ادارہ تبلیغ الانساب مطبوعہ لاہور اور حضرت پیر بابا کے مزار شریف پر نصب شدہ سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے اس میں سید عبدالرحیم ابن سید محمود مکی ابن سید محمد ابن امام علی نقیؓ درج ہے۔ اس شجرہ کی رُو سے اخوند درویزہ بابا کے شجرہ میں جو غلطی پائی جاتی تھی یعنی سید محمد مکی کا امام محمد مہدی کا فرزند ہونا (جو چار سال کی عمر میں غائب ہو گئے تھے) اس کا ازالہ ہو جاتا ہے مگر یہاں کسی مستند کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا اگرچہ بعض مؤرخین نے حضرت امام علی نقی کے صرف تین فرزندوں (جعفر حسن عسکری، حسین) کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ نسل صرف دو سے جاری ہے (رحمتہ للعالمین وغیرہ) یعنی جعفر و حسن مگر "سعادت الکونین فی فضائل الحسنین مولفہ شیخ اکرام الدین نبیرہ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور " ائمہ اہل بیت" مولفہ جمیل احمد صاحب مطبوعہ لاہور میں حضرت امام علی نقی کے چوتھے فرزند محمد جن کی کنیت ابو جعفر تھی کا ذکر بھی کیا ہے۔ کنیت سے ظاہر ہے کہ آپ صاحب اولاد ہوئے ہیں اور غالباً نسل بھی جاری ہے پیر بابا صاحب کی اولاد سے ایک اور شجرہ بھی ملا ہے جو مذکورہ بالا شجرہ کی تائید کرتا ہے اس میں اعلیٰ حضرت پیر بابا کا شجرہ سید محمود مکی تک اخوند درویزہ بابا کی روایت کے مطابق ہے اور پھر سید محمود مکی کو ابو جعفر محمد کا فرزند دکھایا ہے اس میں لکھا ہے کہ حضرت امام علی نقی کے چار فرزند تھے (چوتھے حسین لاولد تھے) سید محمد (ابو جعفر) کو فرزند اکبر دکھایا ہے جو حضرت امام علی نقیؓ کی زندگی میں (یا جلد ہی ان کی وفات کے بعد) فوت ہو گئے تھے) ان (سید محمد) کے نو بیٹے تھے (۱) جعفر ۲۔ محمود مکی ۳۔ رحمت ۴۔ اسحاق ۵۔ غیاث الدین ۶۔ لطف اللہ ۷۔ ہدایت اللہ ۸۔ ابو طالب ۹۔ سکندر (سید محمد کے فرزند سید عبدالرحیم تھے۔ اگر مستند روایت مل جائے تو اس شجرہ سے تمام اشکالات رفع ہو جاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ابو جعفر محمد (ابن امام علی نقیؓ) کے نام سے ایک طرف محمد کے نام سے اشتباہ پیدا ہو کر تذکرہ میں ابو جعفر محمد کی جگہ محمد مہدی

اور دوسرے شجروں میں جعفر کے اشتباہ سے جعفر (ثانی. تواب) لکھ دیا گیا ہو.

وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ؏

ماحصل: ساری تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ یا تو عبدالحلیم اثر افغانی صاحب کے قول کے مطابق دو جگہ ناموں میں درستی کر کے اخوند درویزہ باباؒ کے شجرہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے یعنی :۔ سید علیؒ غواص ترمذیؒ بن سید قنبر علیؒ بن سید احمد نورؒ بن سید یوسفؒ نور بن سید محمد نورؒ بخش ترمذی بن سید احمدؒ بغیم بن سید احمدؒ (علی) شاہ بداق بن سید احمدؒ مشتاق بن سید شاہ ایوبؒ ابو تراب بن سید حامدؒ بن سید محمودؒ بن سید اسحاقؒ بن سید عثمانؒ بن سید جعفرؒ بن سید جعفر بن سید عمرؒ بن سید محمدؒ بن سید حسام الدینؒ بن سید شاہ ناصر خسروؒ بن سید جلال گنج علمؒ بخاریؒ بن سید ابوالمؤید امیرؒ علی بن سید عبدالرحیمؒ بن سید محمودؒ مکی بن سید (ابو عبداللہؒ) علی اکبرؒ بن حضرت امام حسنؒ عسکری بن حضرت امام علی نقیؒ بن حضرت امام محمدؒ تقی بن حضرت امام علیؒ رضا بن حضرت امام موسیٰؒ کاظم بن حضرت امام جعفر صادقؒ بن حضرت امام محمدؒ باقر بن حضرت امام علیؒ زین العابدین بن سید الشہداء حضرت امام حسینؒ۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم) بن

(امام الاولیاء حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، سیدۃ النساء حضرت فاطمہ بنت سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

یا موخر الذکر شجرہ کے مطابق سید محمودؒ مکی بن سید ابو جعفرؒ محمد بن حضرت امام علی نقی کے ذریعے سید الشہداء حضرت امام حسینؒ علیہ السلام تک پہنچایا جائے (اس میں ایک پشت کم ہو جائے گی) ان دونوں شجروں میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان دو روایتوں میں جو قوی و ثقہ ثابت ہو جائے وہی اختیار کر لی جائے۔

وَاللہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ ؏

نوٹ

اخوند درویزہ باباؒ ایک جید عالم فاضل تھے۔ متعدد دینی کتب کے مصنف و مؤلف بھی تھے۔ علاوہ ازیں ماہر علم الانساب بھی تھے (ان کی تصنیف تذکرۃ الانساب کا حوالہ "حیات و آثار حضرت اخوند درویزہ اور ان کا فلسفۂ تصوف غیر مطبوعہ مؤلفہ ڈاکٹر حافظ عبدالغفور صاحب میں موجود ہے) تقریباً انتیس سال انہوں نے اعلیٰ حضرت پیر بابا علیہ الرحمتہ کے ساتھ گزارے اور آپ کے حالات کی معلومات کا ذخیرہ بھی انہی کی تالیفات و تصنیفات سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا شجرہ نسب کے متعلق ان کی روایت کو زیادہ وقعت حاصل ہے مگر غالباً نقل اور کتابت کرنے والوں سے سہواً دو تین جگہ ناموں میں رد و بدل ہوا جس کی وجہ سے شجرہ میں اشکال پیدا ہو گیا۔ وہ خود اس تساہل سے مبرا ہوں گے قاضی عبدالحلیم اثر افغانی صاحب نے اس کی تصحیح کے لئے خاص محنت کی ہے۔

جَزَاہُ اللہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء

تَمَّتْ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الْاَمِيْنِ ۝

وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

وَالْحَمْدُ وَالشُّكْرُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

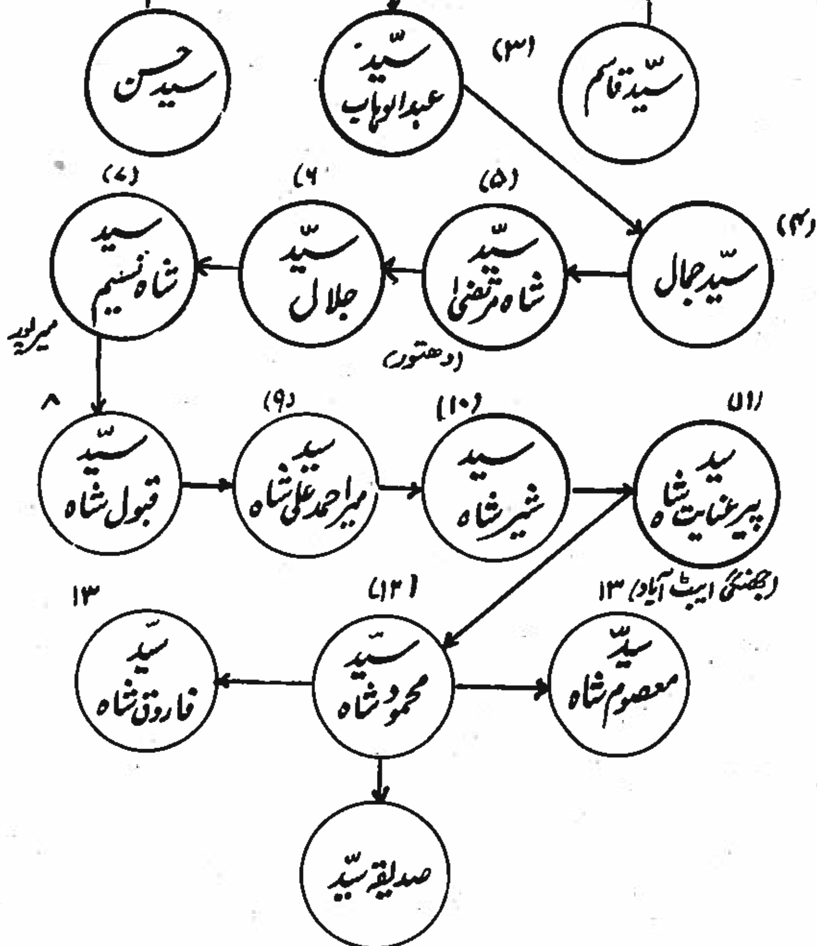
کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مؤلف
۱-	تذکرۃ الابرار و الاشرار	اخون درویزہ بابا
۲-	عبرۃ للابصار (قلمی)	سید عبدالجبار شاہ ستھانوی
۳-	مقدمہ حیات پیر بابا و بحث شجرہ نسب } قلمی	قاضی عبدالحلیم اثر افغانی
۴-	سعادت الکونین فی فضائل الحسنین	مفتی اکرام الدین نبیرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح
۵-	سفینۃ اولیاء	شہزادہ داراشکوہ
۶-	آئمہ اہل بیت	محمد جمیل احمد ایم اے
۷-	حضرت میر کبیر سید علی ہمدانی	ڈاکٹر محمد ریاض
۸-	تاریخ ہزارہ	راجہ محمد ارشاد
۹-	قول الجمیل	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۱۰-	تذکرہ و سوانح سلطان الاولیاء	سید معین باچا
۱۱-	تذکرہ علماء و مشائخ سرحد	سید امیر شاہ قادری گیلانی
۱۲-	دائرۃ المعارف اسلامی	پنجاب یونیورسٹی
۱۳-	شجرہ سادات حسینی مہ ۵	ادارہ تبلیغ الانساب لاہور
۱۴-	تاریخ ہزارہ	میجر ویبس
۱۵-	تذکرہ صوفیائے سرحد	اعجاز الحق قدوسی
۱۶-	حیات و آثار "اخون درویزہ" اور ان کا فلسفہ تصوف	پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالغفور

شجرہ نسب سیّد محمود شاہ ترمذی

غوث زمان سیّد علی غواص ترمذی
المعروف پیر باباؒ (بونیر سوات) ۱

سیّد مصطفیٰ (کونڑ۔ افغانستان) (۲)



اس صفحہ پر اعلیٰ حضرت پیر باباؒ سے نسبی تعلق رکھنے والے حضرات اپنا شجرہ نسب درج کر سکتے ہیں۔

